اسلامیانِ ہند کے ملّی مسائل

مولانا محمد شہاب الدین رضوی بریلوی

رضا اکیڈمی
۵۲، ڈونگاڈ، اسٹریٹ، کھڑک، ممبئی۔۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامیانِ ہند کے ملّی مسائل

(ماہنامہ سنی دنیا بریلی کے چند اداریوں کا مجموعہ)

مولانا محمد شہاب الدین رضوی بریلوی

ناشر

رضا اکیڈمی ممبئی

باہتمام

اسلامک ریسرچ سینٹر

۵۸/کسگران، سوداگران، بریلی شریف، یوپی

بفیض : شہزادۂ اعلیٰ حضرت تاجدار اہل سنت حضور مفتی اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ

سلسلۂ اشاعت نمبر 590

نام کتاب : اسلامیانِ ہند کے ملّی مسائل

مصنف : مولانا محمد شہاب الدین رضوی بریلوی

حسبِ فرمائش: مولانا الحاج محمد سعید نوری، چیرمین رضا اکیڈمی ممبئی

تصحیح : مولانا محمد کوثر علی رضوی، مرکزی دارالافتاء، سوداگران بریلی

سال اشاعت: جنوری ۲۰۰۸ء/محرم الحرام ۱۴۲۹ھ

تعداد : گیارہ سو (۱۱۰۰)

کمپوزنگ : نوری کمپیوٹر، سیلانی، پرانا شہر، بریلی۔فون:9897242575

ناشر : رضا اکیڈمی ڈونتاڈا اسٹریٹ، کھڑک ممبئی

باہتمام : اسلامک ریسرچ سینٹر

58 کسگران، سوداگران، بریلی شریف

تقسیم کار : کتب خانہ امجدیہ ملّیا محل، جامع مسجد دہلی

ملنے کا پتہ :

مکتبہ رحمانیہ، درگاہِ اعلیٰحضرت سوداگران، بریلی شریف

جماعت رضائے مصطفےٰ، اسلام پورہ، مالیگاؤں ضلع ناسک

رضوی کتاب گھر، جامع مسجد باسنی ضلع ناگور

مکتبہ المصطفی، قادری مسجد گلی منیہاران، بریلی شریف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامیانِ ہند کے معاشی، اقتصادی، سیاسی اور تعلیمی مسائل کا حل

ہندوستان میں ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو جشن زریں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے کیونکہ اسی دن ملک انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوا۔ اس آزادی کے حصول میں معاشرے کے سبھی طبقوں نے اپنا کردار پوری دیانت داری سے ادا کیا۔ آزادی کی اس تحریک میں اپنے ہم وطنوں کے ساتھ مل کر مسلمانان ہند اور ان کی قیادت نے بھی اپنی قومی و ملی ذمہ داریوں کو احسن طریقے پر انجام دیا، اور حصول آزادی کے اس خاردار سفر میں کسی بھی قربانی سے دریغ نہ کیا۔ آزادی کے حصول کے بعد ملک کی قیادت نے ایک ایسے آئین کی تیاری کا آغاز کیا کہ جس کی رو سے تمام ہندوستانی شہری چاہے ان کا تعلق اکثریتی طبقہ سے ہو یا اقلیتی طبقہ سے یا پس ماندہ طبقہ سے سب کو مساوی حقوق دیئے جائیں گے، اور ملک میں ایک ایسا معاشرہ وسماج تشکیل دیا جائے گا جس کی بنیادیں جمہوریت، سیکولرزم، اور برابری وانصاف کی اساس پر رکھی جائیں گی۔ سماج کے ہر طبقہ کی عزت وآبرو، جان ومال، عقائد وافکار، اخلاقیات، اقتصادیات، تہذیب

وتمدن اور تاریخی اساس کو مکمل تحفظ ہی فراہم نہ کیا جائے گا، بلکہ واضح ضمانتوں کے ساتھ ان کو مزید ترقی کرنے اور پھلنے پھولنے کے مواقع کی فراہمی کو یقینی بنانے کے لیے بھی آئینی تحفظات فراہم کئے جائیں گے۔ چنانچہ ایک مشترکہ کمیٹی نے بالکل ایسا ہی آئین تیار کیا اور ۲۶ رجنوری ۱۹۵۰ء کو وہ نافذ العمل بھی ہو گیا۔

دستور ہند

مسلمانان ہند کے لئے یہ بات قابلِ اطمینان تھی کہ آئین ہند نے ہندوستان کے دوسرے شہریوں کے تمام طبقات کی طرح ان کو بھی مساوی حقوق دیئے، اور ضروری آئینی تحفظات بھی فراہم کئے کہ جن کی رو سے ان کو مکمل مذہبی آزادی حاصل ہوئی ہے۔ مسلم پرسنل لاء اور شریعتِ اسلامیہ کے معاملات میں عدم مداخلت کی واضح ضمانتیں دی گئیں اور اپنے تعلیمی، سماجی، ثقافتی ادارے قائم کرنے کے لئے بھی ضروری تحفظات و مراعات کو آئین ہند کا حصہ بنایا گیا۔ وقف اور حج معاملات کے سلسلہ میں بھی وقف ایکٹ اور مرکزی وصوبائی سطح پر حج کمیٹیاں قائم کر کے مسلمانانِ ہند کے مذہبی جذبات کا احترام کیا گیا۔

الغرض زندگی کے ہر شعبہ میں تحفظات کا مکمل جال پھیلا دیا گیا۔ یہ تمام تر صورت حال حوصلہ افزا بھی ہے اور خوش آئند بھی، مگر یہ تصویر کا محض ایک رخ ہے۔ دوسرے پہلو پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے، وہ رخ بھی نظر انداز نہیں کر سکتے ہیں۔ اس کی بھی اتنی اہمیت وافادیت ہے جتنی نقش اول کی ہے۔

یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی بھی ملک کا آئین کتنا ہی مکمل و مفصل و جامع کیوں نہ ہو، جب تک قانون ساز ادارے انتظامیہ، عدلیہ اس کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ نہ ہوں تو ان مقاصد کا حصول مکمل نہیں ہو پاتا جن کی پاسبانی و پاسداری کی ضمانت اس میں دی جاتی ہے۔ ان سبھی کا آپس میں ہم آہنگ ہونا بہت ضروری ہے۔

جمہوریت

قابل غور وفکر یہ ہے کہ جمہوری نظام کا مزاج کچھ اس طرح کا ہوتا ہے کہ اس میں اعداد وشمار کی بنیاد پر سارے فیصلے کئے جاتے ہیں اور اس میں وہ گروپ حاوی رہتا ہے جس طرف ان اعداد وشمار کا جھکاؤ ہوتا ہے، بہ الفاظ دیگر اکثریت معاملات اور فیصلہ سازی کے عمل پر حاوی ہوجاتی ہے، اور اقلیتی طبقہ اس کے رحم وکرم کے محتاج ہوجاتا ہے۔

بعض اوقات یہ امکان لگا رہتا ہے کہ مسلمانانِ ہند کیوں کہ ایک اقلیتی طبقہ ہے، لہٰذا وہ اس دائرے میں شامل ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں اس کے حقوق کی بحالی اور حصول کا دارومدار اس کے اکثریتی طبقہ کے ساتھ تعلقات پر کہیں زیادہ ہے، بہ نسبت آئین اور آئینی تحفظات کے۔ اسلامیان ہند کے لیے یہ خاص توجہ کی چیز ہے کہ جب مردم شماری ہو، شناختی کارڈ اور ووٹر سازی ہو یا لسانی ومذہبی شناخت و پہچان کی بات ہو، تو اس وقت حکومتی عملہ کی مدد کر کے اپنا اور اپنے پورے گھر پریوار محلّہ و گاؤں کے لوگوں کا نام درج کرائیں اور معلومات فراہم کریں تاکہ مرکزی سطح پر اعداد وشمار میں اضافہ ہو، پھر اسی اعتبار سے منصوبہ بندی کی جاسکے۔

اکثریت

ہندوستان میں اکثریتی طبقہ سے عمومی طور پر یہ تعلقات کشیدہ نہیں ہیں، مگر اس حقیقت سے انکار کرنا حقائق سے روگردانی کے مترادف ہوگا کہ اکثریت اور مسلمانانِ ہند کے تعلقات میں کچھ کڑواہٹ بھی ہے۔ ایک دوسرے کی طرف کچھ شکوک وشبہات بھی ہیں، اور اکثریتی طبقہ میں کچھ ایسے عناصر موجود ہیں کہ جو آئے دن ایسے فتنوں کو جگاتے رہتے ہیں، جس سے اس کڑواہٹ میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ ہندو مسلم فسادات، مسلم پرسنل لاء سے متعلق معاملات، اردو زبان کا مسئلہ۔ بابری مسجد تنازعہ، تاریخی حادثات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جانا۔ اسلام کی منفی اور جارحانہ

تصور پیش کرنا۔ عام مسلمانوں کے بارے میں شکوک وشبہات پر مبنی رائے رکھنا، مسلم معاشرہ کو ہندوستانی معاشرہ میں ایک الگ تھلگ حصہ سمجھنا اور اسی طرح کی اس کی تصویر کو پیش کرنا اور عام کرنا، حال ہی میں آر ایس ایس کی طرف سے اس بات کا مطالبہ کیا کہ قرآن شریف سے ان ۲۴ آیات کو نکال دیا جائے جن سے غیر مسلموں کو قتال کا حکم دیا گیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ کچھ ایسے معاملات ہیں جن کو فرقہ پرست جماعتیں، تنظیمیں ووعناصر وقتاً فوقتاً ہوا دیتے رہتے ہیں۔ جس کے اثر سے بعض اوقات ہمارے ذمہ داران اربابِ حکومت، افسران، ملازمین بھی نہیں محفوظ رہ پاتے۔ اور یہ زہر پھیلتا ہی جاتا ہے، اسلامیانِ ہند کی بدنصیبی ہے کہ زہر اس وقت اپنے شباب پر ہے۔ آزادی کے بعد تقسیم ہند کو لے کر اور بعد میں اس کے اثرات کو لے کر اور پھر اوپر بیان کئے گئے مسائل ونکات کو لے کر یہ کڑواہٹ متعصّبانہ رویوں کو جنم بھی دیتی رہی ہے اور بڑھاوا بھی۔

اس طرح کے رویوں کو بڑھاوا دینے میں جہاں فرقہ پرست عناصر کا دخل ہے، وہیں مسلمانانِ ہند میں بھی کچھ ایسے عناصر موجود ہیں جو جذباتیت وجنون میں اس حد تک غرق ہوجاتے ہیں کہ چند ناقابل معافی نادانیاں اور غلطیاں کر گزرتے ہیں، جس سے ایک طرف تو اکثریتی فرقہ پرستی کو بڑھاوا ملتا ہے، تو دوسری جانب اس بڑھتی ہوئی اکثریتی فرقہ پرستی کو ضروری غذا اور مواد بھی میسر آجاتا ہے۔ لہٰذا اس کڑواہٹ اور آلودگی کے اثر کو مدنظر رکھتے ہوئے ہی مسلمانانِ ہند اور ان کی قیادت کو اپنے فیصلے کرنے پڑیں گے، ایسا قوم مسلم کی بھلائی کے لئے تو ضروری ہے ہی، مجموعی قومی مفاد کا تقاضا بھی یہی ہے۔ حالاتِ حاضرہ کے پیش نظر مواقع کو دیکھتے ہوئے فیصلوں کی ضرورت ہے۔

مسلم قیادت

لمحہ فکریہ ہے کہ مسلمانانِ ہند کے پاس بظاہر نہ قائدین کی کمی ہے، اور نہ ہی تنظیموں وجماعتوں کی، نہ ہی ایسی شخصیات کی جن کا موضوع بحث ملت اسلامیہ کی بد

سے بدتر ہوتی ہوئی صورتِ حال، اور نہ ہی ایسے حضرات کی کمی ہے جو اس افسوس ناک صورت حال کے ازالہ کے لئے آرزومند ہیں۔ تاہم ان سب کے باوجود بھی آج مسلم معاشرہ گروہ بندی، آپسی منافرت، ذہنی انتشار ونفسیاتی اضطراب اور دیگر ایسے ہی امراض ولعنتوں میں مبتلا بھی ہے اور ان کا شکار بھی۔

میں یہاں مسلم قائدین وتنظیموں وجماعتوں کا احتساب کرنے یا اس پر تنقید وتنقیص کرنے کی غرض سے ان کو اپنا موضوع بحث نہیں بنا رہا ہوں، بلکہ میں اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے آگے بڑھنا پسند کروں گا کہ یہ تمام جماعتیں اپنے اپنے پروگراموں کو اپنی بساط کے مطابق چلا رہے ہیں، اپنے اپنے ذرائع وابلاغ کا استعمال کرنے، اپنی بساط کے مطابق کام بھی کر رہے ہیں، اس کی افادیت بھی مسلم ہے، مگر قومی وملی مسائل، اجتماعیت ومشاورت دونوں کا تقاضہ کرتے ہیں؟ افسوس اس امر کا ہے کہ ایسا کوئی نظام آج ہمارے درمیان میں موجود نہیں ہے۔ اسی وجہ سے ہم ایک ایسے معاشرہ کی شکل میں ابھر رہے ہیں کہ جو سب سے زیادہ اجتماعیت، اتفاق رائے، باہمی مشورے اور افہام وتفہیم کا درس دینے والا تو ہے مگر عمل کرنے والا نہیں، جبکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن عظیم میں آپسی صلاح وشوکت پر زور دیا۔ وامرھم شورا بینھم فرمایا گیا۔ دیکھا تو یہ بھی گیا ہے کہ ایک ہی گھر میں کئی کئی تنظیموں کے بورڈ لگے ہوئے ہیں اور ہر تنظیم کل ہند صدر اور کل ہند جنرل سکریٹری سے کم نہیں ہے۔ اور یہ دونوں عہدے نیشنل پیمانہ کے ایک کمرے میں موجود ملیں گے۔ اب ایسی صورت حال میں کیا تنظیمی وتحریکی اور جماعتی شکل بدستور قائم ہوسکتی ہے؟ یہ اپنے آپ میں ایک اہم مسئلہ ہے، اس کے لیے خلوص وایثار کی اشد ضرورت درکار ہوتی ہے۔

سیاسی قیادت

موجودہ حالات میں جو مسلمان سیاست کے میدان میں ہیں، ان میں سے بہت سے اتنی خوشامدوں کے بعد اسمبلی اور پارلیمنٹ کی ممبری یا ایسے ہی کسی اور مرتبہ و

عہدے تک پہونچے ہیں کہ ان میں قومی وملی ذمہ داری کا شعور و احساس ہوتے ہوئے بھی، وہ اپنے اس فرض کی ادائیگی سے یا تو احساسِ کمتری کے باعث مجبور ہیں، یا پھر یہ سوچ کر خاموش تماشائی بن کر رہ جاتے ہیں کہ کہیں آقا ناراض نہ ہو جائیں۔ ڈسپلن کی خلاف ورزی نہ ہو جائے۔ یہ مرتبہ ہم سے چھن نہ جائے۔ آئندہ انتخابات لڑنے کا موقع ملے کہ نہ ملے وغیرہ وغیرہ۔ جب کہ یہ طبقہ یہ بھولتا ہے کہ اس ملک اور اس نظام میں اگر فرقہ پرست تنظیموں کو بھی اقتدار حاصل ہوگا تو وہ بھی مسلمانانِ ہند کو نمائندگی دینے پر مجبور ہوں گے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ رحم وکرم کی سیاست کا دامن چھوڑنا ہوگا، سینہ ٹھوک کر اپنا حق ونمائندگی لینے کا حوصلہ پیدا کرنا ہوگا اور اسی کو اپنا شعار بنانا ہوگا۔

المیہ یہ بھی ہے کہ بہت سے ایسے حضرات بھی سیاست کے میدان میں موجود ہیں کہ جن کو قومی وملی مسائل سے آگاہی ہی نہیں ہے۔ اور وہ مذہب ومسلک کی خدمت کا قطعاً جذبہ نہیں رکھتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ کیا واقعی یہ اہل اسلام میں سے ہیں؟

خوف وہراس

خوف وہراس کا ماحول ہندو فرقہ پرستی کے بڑھتے ہوئے رجحانات کو لے کر ہے، گورنمنٹی مشنریوں کے بعض اوقات مسلم مخالف روش کو لے کر ہے۔ مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے اور معمولی معمولی کاموں میں رخنا ڈال کر گول مول کا رویہ اپنانا، یا کوئی الزام لگا کر کام کو نہ کرنا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ عام مسلمان اپنے آپ کو غیر محفوظ تصور کرتا ہے، اس کا یہ خوف بنیادی وجوہات کی بنا پر ہے۔ ایک تو یہ کہ چند سر پھرے جذباتی نام ونہاد مسلم قائدین اشتعال انگیز روش کی بدولت بڑھنے والی نفرتوں کو لے کر ہے، اور دوسری جانب اس نفرت سے پیدا ہونے والی شدت پسندی اور تشدد کو لے کر ہے کہ جس کا نشانہ بیچارہ عام مسلمان بنتا ہے اور یہ اپنی سیاسی دوکان چمکاتے ہیں

۔آگ اور لاش پر مردہ باد اور زندہ باد کے نعرے لگوائے جاتے ہیں۔

دوسری وجہ بڑھتی ہوئی ہندو فرقہ پرستی و انتظامیہ کے متعصّبانہ رویے کو لے کر ہے، کیوں کہ بعض اوقات اس کا مزاج مخالف سمت نظر آتا ہے، اور بیچارہ مسلمان اپنے آپ کو ایک ایسی کیفیت میں پاتا ہے جس کا شکار علاوہ اس کے کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔ اس کیفیت کو بعض اوقات دیکھا بھی گیا ہے کہ جب ہندو مسلم فساد ہوتا ہے تو انتظامیہ کے اہل کار متعصّبانہ رویہ کھل کر اپناتے ہیں۔

دوسرے درجے کی شہریت

اسلامیانِ ہند کے تعلق سے محرومی و مایوسی کے احساس کی بنیادی وجہ ایک مسلمان کے ساتھ ہونے والا وہ سلوک ہے کہ جس سے روزمرہ کی زندگی میں اس کا سابقہ اور واسطہ پڑتا ہے۔ اس میں ملازمین کے رویے سے لے کر افسران کے رویے تک اپنی نمائندگی و شرکت کی حالت زار کو لے، کر اپنے اندر پلنے والے، اور بڑھتے ہوئے احساس محرومی کو لے کر اور اپنے اردگرد کے معاشرہ میں شکوک و شبہات سے لبریز نگاہوں کو لے کر اپنے آپ کو ایک سوالیہ نشان کی شکل میں پا کر، سیاسی قائدین و جماعتوں کے بہلانے پھسلانے اور بہکانے والے بیانات اور وعدوں کو لے کر تو ہے ہی۔ ساتھ میں اپنی بستیوں، اداروں، معاملات، حالات، اقتصادیات اور سماجی صورت حال کو لے کر بھی اپنے آپ کو احساس کمتری کا شکار ہوتے ہوئے دیکھنا۔ بسا اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسلمان دوسرے درجہ کے شہری ہیں۔ یہ امور دوسرے درجے کی شہریت کے احساس کی جانب واضح اشارے تصور نہیں کئے جائیں گے۔

ملک میں ضرورت ہے عدل و انصاف، غیر جانبداری اور صحت مند رویوں کے قیام و بڑھاوے کی، اس میں برسر اقتدار طبقہ سے لے کر مسلم معاشرہ تک، مسلم جماعتوں سے لے کر تمام اداروں و تحریکوں تک، سیاسی جماعتوں سے لے کر سیاسی قائدین تک،

سب کو اپنا اپنا کردار پوری دیانت داری سے ادا کرنے کی ضرورت ہے۔فلاحی و رفاہی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں اور ملکی تعمیر و ترقی میں کوشاں رہیں۔اور فرقہ پرستوں کی طرف سے افواہوں پر توجہ نہ دیں، ایک کان سے سنیں تو دوسرے کان سے نکال دیں۔

حکومتی اداروں کا دوہرا معیار

مسلمانوں کے ساتھ دوہرے معیار کا احساس بھی گاہے بہ گاہے زور پکڑتا رہتا ہے۔اس کی وجہ سے شاید حکومتی افسران میں ایک ایسے طبقہ کا پیدا ہو جانا ہے کہ جو حکومتی ذمہ داریوں اور فرائض کی انجام دہی میں اپنی ذاتی سوچ اور متعصّبانہ روش کو دخیل ہونے دیتا ہے، جس کے باعث وہ فرائض منصبی کی انجام دہی میں عدل و انصاف اور غیر جانبداری کا دامن چھوڑ بیٹھتا ہے۔اس غیر صحت مند رویے پر لگام لگانے کے لئے افسران کی تربیت کو مزید بہتر، صحت مند اور فعال بنایا جائے، تا کہ ایسی شکایات کا بروقت ازالہ کیا جا سکے اور غیر صحت مند و منفی رویوں کو معاشرہ میں بڑھنے سے روکا جا سکے۔مگر وہ اکثریتی فرقہ کے امور سے دلچسپی رکھتا ہے اور اقلیتی فرقہ سے تعصب رکھتا ہے تاہم حال ہی میں انفارمیشن کمیشن کے آجانے سے فائدہ یہ ہوا ہے کہ اب یہ تعصب کم ہو جائے گا۔

مسلم محض ووٹ بینک

ملکی منظر نامہ پر اگر غور سے دیکھا جائے تو ایسا لگتا ہے کہ مسلم معاشرہ محض ایک ووٹ بینک بن کر رہ گیا ہے، جس کے مزاج کی شکل کچھ اس طرح کی ہے کہ وہ کسی ایک جذباتی مسئلہ کو لے کر ایک فریق سے ناراض اور دوسرے سے بغیر کسی واضح مثبت پہل کے ہی اپنے آپ کو اس کے ہاتھوں میں محض اس کے مفاد کے لئے استعمال ہونے کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دوسرے فریق سے ایسی مایوسی کا تجربہ ہوتا ہے کہ جو کہ پہلے

سے ہوا تھا۔ اب صورت حال یہاں آ پہنچی ہے کہ محض انتشار ہی انتشار ہے، غلط فہمیاں ہی غلط فہمیاں ہیں، اور ہم ایک ایسے معاشرہ کی شکل اختیار کر چکے ہیں کہ جس میں کوئی ایسا نظام مشاورت موجود نہیں کہ جو ملی مسائل اور قومی مفادات کی پاسبانی کے فرائض انجام دے سکے، اور قوم میں مشروط حمایت ومخالفت کا شعور پیدا کر سکے۔ انتخابات کے وقت ہر محلّہ ہر گاؤں میں ایک قائد ہوتے ہے اور وہی پوری امت کی قسمت کا فیصلہ کرے گا۔ ملک کی باگ ڈور اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اگر کسی نے زر اور زمین سے نواز دیا تو وہ خوبیوں کا حامل ہو گیا، چاہے وہ کتنا ہی مسلم مخالف نظریہ کا حامل ہو۔ یہ المیہ نہیں تو اور کیا ہے؟

دوسروں کے ہاتھ کا کھلونا

حقیقت یہ ہے کہ ملکی سطح پر کوئی مخلص اور صالح مسلم قیادت ہے ہی نہیں، اور جو ٹوٹی پھوٹی ہے بھی تو وہ ٹوٹ پھوٹ اور آپسی کشمکش کا شکار ہے۔ ان گنت تنظیمیں، جماعتیں اور قائدین موجود ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے آپ کو صحیح اور دوسرے کو غلط سمجھتا ہے۔ قوم جہالت، افلاس اور غفلت کی تاریکی میں اس حد تک مبتلا ہے کہ اس کا اعتماد سب سے اٹھ چکا ہے، اور ایک مکمل غیر یقینی کی کیفیت سے دوچار ہے۔

بحیثیت قوم ہماری نفسیات مجروح بھی ہے اور مفلوج بھی، ہم غلط فہمیوں اور خوش فہمیوں کے بھنور میں کچھ اس طرح پھنس چکے ہیں کہ کنارہ دکھائی ہی نہیں پڑ رہا ہے۔ اسلامیان ہند اس کے مثل ہیں کہ کشتی سمندر میں دوڑتی جا رہی ہے، ہواؤں کے تھپیڑوں سے ٹکراتے ہوئے، پانی کی لہروں وموجوں اور طوفانوں میں گم ہو جاتی ہے، اس کشتی کے ناخدا کا کوئی پتہ وسرا نہیں ملتا۔ ہم اپنی حالت زار کا ذمہ دار کبھی کسی کو ٹھہرا دیتے ہیں تو کبھی کسی کو اپنی بنیادی ذمہ داری اور فرائض کے احساس سے خالی ایک ایسا معاشرہ بنتے جا رہے ہیں جس کے اندر انتشار، آپسی کشمکش اور بے چینی اس

حد تک بڑھتی جا رہی ہے کہ یہ کسی ایسی بڑی غلطی کو جنم نہ دے دے کہ جس سے دشواریاں اور پیچیدگی اور بڑھ جائیں۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ذمہ داران مملکت، ادارے و تنظیمیں، تمام سیاسی جماعتیں، مسلم قائدین، دانشور طبقہ مسلم معاشرہ کی اس خاموش بے چینی کے محض تماشائی نہ بنیں، بلکہ اس کے ازالہ کے لئے اپنا اپنا کردار بہ طریق احسن ادا کرنے کے لئے بڑھیں۔ یہ مسلم معاشرہ کی بھلائی کے لئے تو ضروری ہے، ہی ملک وقوم کی اجتماعی سلامتی، خوشحال وترقی کے لئے بھی اشد ضروری ہے۔

دینی مسائل

بحیثیت مسلمان ہم میں سے عالم اسلام کے ہر ایک ایک فرد کا یہ عقیدہ ہے کہ ہماری کل کامیابی کا دارومدار دین اسلام یعنی دین فطرت سے والہانہ وابستگی، اور اس پر مکمل عمل پیرا ہونے میں ہی مضمر ہے۔ دین اسلام جس کی تعلیمات کا عملی نمونہ نبی آخر الزماں سید الانبیاء وختم المرسلین محمد عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنی حیات طیبہ میں پیش کر دیا۔ اور ان تمام اعتراضات وغلط فہمیوں کا ہمیشہ کے لئے قطعی ازالہ فرما دیا۔ یہ دین ہم تک خلفاء راشدین، صحابہ کرام، تابعین عظام، اولیاء کرام اور ان کے بعد علماء کرام کے ذریعہ بڑی محنت ومشقت سے پہونچا ہے۔ انہیں اسلامی تعلیمات اور سیرت طیبہ سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے بڑے بڑے مبلغ دین، اولیاء کرام، صوفیاء عظام اور دیگر ایسی ہی اہم شخصیات نے دین اسلام کی روشنی کو تمام عالم میں عام کرنے اور صدائے حق وصداقت کے پرچم کو تا قیامت بلند رکھنے کے لیے اپنی زندگی میں ایسے قابل تقلید نمونے پیش کئے کہ فرزندان توحید کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ راقم السطور کے دفتر میں اوسطاً ہر ماہ چار افراد داخل اسلام ہوتے ہیں، اور اس کا روان حق کا سفر پوری آن وبان اور شان کے ساتھ جاری ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ تا قیامت جاری رہے گا۔ جتنی سختی کے ساتھ اسلامیان ہند اپنے دین پر عمل پیرا ہوں گے اتنی ہی تقویت اور فیوض وبرکات میسر ہوں گے۔

موجودہ صورتِ حال

آج بالعموم مسلمانان عالم وبالخصوص مسلمانانِ ہند اپنے قول وعمل، کردار و اخلاقیات، معاملات اور فہم وفراست سے جو اسلام کی تصویر دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ وہ ایک ایسے دین کی ہے جس میں نہ کوئی کشش باقی ہے اور نہ ہی وہ قابل تقلید ہے (نعوذ باللہ) جب کہ حقیقت اس کے بالکل عکس ہے، کیوں کہ قرآن کریم، احادیث مبارکہ، حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حیات طیبہ، اور اس کے بعد صدیوں تک اولیاء عظام وعلماء کرام کے ذریعہ جو دین اسلام کی تصویر پیش کی جاتی رہی، وہ ہی حقیقی اسلام ہے۔ لہٰذا آج کے مسلمان اور آج کے دینی پیشوا اور آج کے دینی ادارے جس طرح مسلمانوں کی تربیت کر رہے ہیں، وہ نہ پوری طرح علم وعمل کے میدان میں کوئی ممتاز مقام رکھتے ہیں، اور نہ ہی مذہبی روزمرہ کی زندگی میں ان کی اور ایک عام دنیادار مسلمان کی زندگی میں ہی کچھ خاص فرق نظر آتا ہے۔ کیوں کہ خامیاں، کمزوریاں اور کوتاہیاں ہم میں ہیں نہ کہ دین اسلام میں۔ افسوس کا مقام ہے کہ تجارت میں وعدہ خلافی، امانت میں خیانت، غیبت وچغل خوری، دھوکہ دہی وفریب کاری، کم ناپ تول، بدعہدی، حسد وکینہ وغیرہ وغیرہ کو اپنا شعار بنالیا ہے۔ جبکہ پوری دنیا جانتی ہے کہ اسلام دین حق ہے اور نجات وفلاح کا واحد راستہ بھی ہے۔

وقف املاک کی صورتِ حال

وقف املاک مسلمانانِ ہند کا یہ ایک بنیادی مسئلہ ہے جس سے ان کی ترقی، خوشحالی، اقتصادی وسماجی انقلاب کا براہِ راست تعلق ہے۔ اس مسئلے کا تعلق ان وقف زمینوں، جائدادوں واملاک سے ہے جن پر ناجائز قبضے ہیں، جھوٹے دعوے ہیں۔ ملک کے مختلف چھوٹی بڑی کورٹوں میں مقدمات برسہابرس سے زیر سماعت ہیں یا پھر کچھ ایسی زمینیں ہیں کہ جن پر حکومتی، نیم حکومتی یا خالص غیر حکومتی اداروں، تنظیموں ء

جماعتوں نے رہائشی دفتری وتجارتی کمپلیکس قائم کر لئے ہیں، اوران زمینوں کا کوئی معاوضہ وقف بورڈ کو نہیں دیا جاتا ہے۔ بہت سی زمین ''ہرت پٹی'' کے نام سے گورنمنٹ نے اپنے قبضے میں لے لی ہے۔ کچھ زمینوں پر تعلیمی ادارے بھی قائم کر لئے گئے ہیں۔ اس تمام تر صورتِ حال کو سمجھنے اور اس کے حل کے لئے کچھ بنیادی نکات کو سمجھنا ہوگا، جو حسب ذیل ہیں۔

کوئی بھی ایسی زمین، جائداد، ملکیت، رقم یا ادارہ جس کا استعمال وقف کرنے والے کی خواہش اور وصیت کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ اس لئے کہ وقف املاک کا استعمال کیا بغیر ولی کی مرضی کے درست نہیں۔

کوئی بھی صاحبِ استطاعت شخص تنظیم یا جماعت یا پرانے دور میں بادشاہ شہزادہ یا شہزادی، نواب، جاگیردار یا زمیندار وغیرہ یا اس کے اندر موجود مفلس و نادار طبقہ کی کفالت کی غرض سے جائدادوں کو وقف کیا کرتے تھے۔ اسی طرح سے کچھ اولیاء کرام کی درگاہوں اور آستانوں کے نظام کو احسن طریقہ پر چلانے کے لئے وقف کی جاتی تھیں، اور کچھ زمینیں جائدادیں واملاک، رفاہ عامہ یعنی عوامی فلاح و بہبود کی غرض سے وقف علی اللہ کی جاتی تھیں، وقف کرنے کا یہ طریقہ شرعی ہے اور ایسا اللہ تبارک وتعالیٰ کی نصرت وخوشنودی کے ساتھ ساتھ ثواب کی غرض سے کیا جاتا ہے اور یہ صدقۂ جاریہ بھی۔ وقف علی الاولاد بھی ایک قسم ہے۔

موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ غیر فعال اور غیر موثر وقف بورڈ کی کارکردگی کی وجہ سے وقف بورڈ میں غلط اور ناپاک عزائم کو لے کر گھسنے والے کچھ ممبران کی خورد برد، اور نااہلی کی وجہ سے کچھ گورنمنٹی مشینری کی ڈھیل کی وجہ سے اور کچھ مسلم معاشرہ کی بے توجہی کے باعث وقف املاک روز بروز کم سے کم تر ہوتی جارہی ہیں۔ متعلقہ پولیس افسران، انتظامیہ اور کچھ غیر دیانت دار وقف ممبروں یا بورڈ کے ملازمین وذمہ داران کے ساز باز کر کے وقف املاک کو خورد برد کیا جارہا ہے۔ کچھ املاک مقدمات کی

نذر ہو رہی ہیں اور کچھ پر غاصبانہ قبضے کرنے کے بعد بڑے بڑے تعلیمی، کامرشیل دفاتر و کمپلیکس تعمیر ہو چکے ہیں۔

جہاں تک وقف کے مقاصد کے حصول کا تعلق ہے، اور ان مقاصد کے ذریعے مسلم معاشرہ کی فلاح و بہبود کی سرگرمیوں کا تعلق ہے، تو اس کے لئے قانونی رکاوٹیں ہیں، مگر غاصبوں کو کھلی چھوٹ ہے۔ یہ ہے آج وقف املاک کی صورتِ حال۔ اگر صحیح طریقہ سے وقف کی آمدنی یکجا کر لی جائے تو مسلمانوں کو حکومت کے رحم و کرم پر نہ رہنا پڑے گا۔

تعلیمی اداروں میں مسلم کوٹہ

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جب تک ہندوستان کے ۲۵ کروڑ مسلمان ترقی کے تیز رفتار عمل کے مثبت اثرات سے پوری طرح بہرہ مند نہیں ہوں گے۔ میرا یہ وطن عزیز اکیسویں صدی میں ایک ترقی یافتی ملک، معاشرہ اور نظام کی شکل میں داخل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلم معاشرہ میں تعلیمی ترقی اور خوشحالی کو فروغ دینے کے لئے روزگار کی فراہمی کو یقینی بنایا جائے۔ آج کا مسلم معاشرہ ناخواندگی، جہالت، افلاس، محرومی اور پچھڑے پن کی لعنتوں کا شکار ہے۔ ان حالات نے ایک عام مسلم ذہن میں احساس کمتری کو بڑھاوا دیا ہے۔ اس کے حوصلہ اور عزم میں شگاف پیدا کیا ہے۔ ترقی کی تیز رفتاری کو سست رفتاری سے بدل دیا ہے۔ اس لئے یہ اور بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ تعلیم کے فروغ اور پڑھے لکھے مسلم نوجوانوں کو حکومتی و نیم حکومتی اداروں میں مسلم آبادی کے تناسب کو ملحوظ رکھتے ہوئے باضابطہ کوٹہ مقرر کیا جائے۔

مسلم کوٹہ مقرر کئے جانے سے ہی مسلم معاشرہ میں خود اعتمادی پیدا ہوگی۔ تعلیم کا فروغ ممکن ہو سکے گا۔ علم کی روشنی عام ہو پائے گی۔ صحیح اور صحت مند روش اور رویے

اپنی جگہ بنا پائیں گے۔ جدید دور کے تقاضے پورا کرنے اور اس کے مطابق اپنی فکر کو ڈھالنے کا عزم پیدا ہو سکے گا۔ دقیانوسی، فرسودہ اور غیر منطقی رجحانات سے لاتعلقی ممکن ہو سکے گی۔ ملک کی مجموعی ترقی میں ان کی شمولیت مناسب و متناسب ہو پائے گی۔

تعلیم کا فروغ اور تعلیمی سرگرمیوں میں روز افزوں اضافہ وہ لازم ملزوم عمل ہے، کہ جس سے کسی بھی معاشرہ کی اصلاح اور فلاح دونوں کا ہی براہِ راست تعلق ہوتا ہے۔ لہٰذا کسی بھی ایسے سماج کو جس میں اس صورتِ حال کا فقدان پایا جاتا ہو، اس کی حوصلہ افزائی ہمارا ملی فریضہ ہونے کے ساتھ ساتھ قومی فریضہ بھی بن جاتا ہے۔ ایسی صورت حال میں اگر مسلمان بچوں کے لئے تعلیمی اداروں میں بھی واضح کوٹہ مقرر کر دیا جائے، تو ایک طرف تو اس کا اثر یہ ہوگا کہ مسلمانانِ ہند کا رجحان اعلیٰ اور معیاری تعلیم کی طرف بڑھے گا، تو دوسری طرف ملک کی اتنی بڑی آبادی سے جہالت اور ظلمت کے اندھیرے دور ہوں گے، بالخصوص ایسے حالات میں کہ جب اس پڑھے لکھے طبقہ کو ملازمتوں میں بھی کوٹہ فراہم کیا جا رہا ہوگا۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ فوری اس مسئلہ کی طرف ذمہ دارانِ ملت و حکومت توجہ دیں۔

یہ کہاں کا انصاف ہے کہ محض چند ذاتوں اور قبیلوں سے تعلق رکھنے والے ایک مذہب کے ماننے والوں کے لئے تمام تحفظات اور کوٹے موجود ہیں، جب کہ دوسرے مذہب کے ماننے والوں کے لیے بالکل وہی سماجی و اقتصادی پستی کے باوجود کوئی تحفظ یا کوٹے کا تصور نہیں۔ یہ اصول سماجی، سیاسی و اقتصادی انصاف کے اس ضمانت کے بھی خلاف ہے، جو ہندستانی آئین کا حصہ بھی ہے اور اس کی روح بھی۔

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ منڈل کمیشن میں جو مسلمانانِ ہند کے کچھ حلقوں کی شمولیت ہے اس کا فیض ان کو برائے نام ہی پہنچ پائے گا۔ اس کی وجہ وہ متعصبانہ روش ہے جس کا عام مسلمان فرقہ واریت کے بڑھتے ہوئے زہر کے باعث آج شکار ہے۔ لہٰذا اگر کسی شخص کو ''یادو اور ''دلت'' کہہ کر کوٹہ دیا جا سکتا ہے تو ہم کو

''مسلمان'' کے نام سے بھی دے دیا جائے تو اس میں کسی کے اعتراض کے لئے کوئی جواز موجود نہیں ہے۔ البتہ اس کوٹہ کی بنیاد مذہب نہ ہو کر محض سماجی و اقتصادی پچھڑا پن ہونا چاہیے، یہ کوٹہ علیٰحدہ سے ہو اور اس کا اطلاق مسلمانان ہند پر بالعموم ہو، نہ کہ مسلم معاشرہ سے تعلق رکھنے والے کچھ پیشوں سے تعلق رکھنے والے حضرات پر۔ کیونکہ مسلمان کی ترقی ملک کی ترقی ہے، سچر کمیٹی کی سفارشات خدا کرے نافذ العمل ہو جائیں۔ اس کمیشن نے مرکزی حکومت کو سفارشات تو کر دیں ہیں مگر ان پر کتنا عمل کیا جاتا ہے، یہ سربراہان مملکت کے عندیہ پر محمول کرتا ہے۔ جبکہ راقم السطور نے سچر کمیٹی کے لئے بلائی گئی میٹنگوں میں متعدد مرکزی شرکت کی، جس میں اعلیٰ ذمہ دار اور متعدد مرکزی وزرا نے بھی شرکت بھی کی۔

اقتصادی مسائل

موجود دور کو اقتصادی دور یا Age of economics کہا جا رہا ہے۔ دنیا کے ہر ملک و معاشرہ میں اقتصادی ترقی کی غرض سے ہر سطح پر کوششوں اور پہلوؤں کا سلسلہ جاری ہے۔ آزاد منڈی کا تصور، نجی شعبہ کو ترقی کے کم و بیش زندگی کے ہر شعبوں میں بھرپور مواقع، اس تصور کی حکومتی اداروں، پالیسیوں و پروگراموں کے ذریعہ پشت پناہی نرم درآمدی پالیسی لائسنس جاری کرنے کا آسان طریقہ اور لائسنس کے نظام کو بتدریج کم سے کم تر کرنے کی سمت میں کوشش، بینک و مالی اداروں سے قرضوں کی فراہمی کے عمل میں مزید آسانیاں، حصص بازار میں روز افزوں بڑھتی ہوئی تجارت، کچھ ایسی بنیادی اصلاحات و تبدیلیاں ہیں کہ جس سے تاجر برادری میں حوصلہ مندی کے بڑے واضح رجحانات دیکھنے کو مل رہے ہیں۔ اور معاشرے کے ہر طبقے میں ہی ان اصلاحات سے بھرپور استفادہ کرنے کی جیسے ہوڑ سی لگ رہی ہے، مگر مسلم معاشرہ ان مثبت اور کھلی تبدیلیوں سے بھی مکمل استفادہ کرنے میں ناکام نظر آ رہا ہے کہ جس کی بنیادی وجہ شاید ان اصلاحات اور تبدیلیوں کی مکمل اساس کو کم خواندگی یا

ناخواندگی کے باعث نہ سمجھ پانا تو ہے ہی، وہیں ساتھ ہی کچھ دیگر ایسے مسائل بھی ہیں جن کی طرف توجہ کرنی اور ان کو زیر بحث لانا ضروری ہے۔

صنعت وحرفت میں مسائل کی نشاندہی

☆ مسلمان بہترین دستکار مگر لاچار ہیں

☆ مسلمان بہترین ہنرمند اور اپنے پیشہ کا ماہر مگر اس کی حیثیت محض ایک مستری سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے۔

☆ مسلمان بہترین ورکر، کاریگر، ڈائی میکر، کپڑا بننے والا، لکڑی کا کام کرنے والا، خرد کا کام کرنے والا اور میکینک مگر اس کی حد صرف یہیں تک دے کر ترقی کے منازل محض خواب وخیال ہیں۔

☆ ملک کی بنیادی صنعت میں مسلمانوں کا حصہ نہ ہونے کے برابر ہے۔

☆ بڑے صنعت کاروں کی فہرست میں کسی مسلمان کا نام تلاش کرنا تقریباً ناممکن سا ہے۔

☆ بڑے بڑے بازاروں میں مسلمان دوکانداروں کا تناسب اعداد و شمار میں نہیں نکالا جا سکتا۔

☆ حکومتی اداروں کا مسلمان تاجروں کے ساتھ متعصّبانہ سلوک رہتا ہے۔

☆ اقلیتوں کے لئے شروع کی گئی اسکیموں اور دیگر مراعات کا فیض مسلمانوں کو برائے نام ہی پہنچ پاتا ہے۔

☆ بینک و دیگر مالی اداروں کے ذریعہ جاری کئے جانے والی قرضوں میں مسلمان تاجروں کا حصہ کیا محض ایک فیصد بھی ہے، شاید نہیں۔

☆ مسلمان جو کہ ملک کی دوسری سب سے بڑی اکثریت ہے اگر نسل پچھڑے پن افلاس اور محرومی کا شکار رہے گی تو کیا یہ ملک کبھی ترقی یافتہ

ممالک کی فہرست میں کھڑا ہو سکے گا؟ شاید نہیں۔

☆ مسلمانانِ ہند کی ترقی کو دیگر طبقات کی ترقی کے عمل کے ساتھ ہم آہنگ کرنے میں حکومتی سطح پر غیر موثر کارکردگی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے

☆ مسلمانانِ ہند ہمارے معاشرہ کا سب سے کمزور اور نادار طبقہ ہے۔

☆ مسلمانانِ ہند میں احساس محرومی کے بڑھتے ہوئے رجحانات اقتصادی عمل کی سست رفتاری کی بنیادی وجہ ہے۔

☆ مسلمان تاجروں کو مسلم سیاست دانوں کی بھی پشت پناہی حاصل نہیں ہے۔

☆ اقتصادی بحالی سے متعلق مطالبات حکومت کے سامنے رکھنے کی بھی کسی سمت سے کوئی واضح کوشش و پہل نہیں ہوئی۔

☆ مسلمانانِ ہند اپنے پارلیمانی و صوبائی ایوانوں میں جانے والے حضرات سے اپنے اپنے حلقوں کی ترقی و خوشحالی کے لئے ایک ایسے اقتصادی عمل کا مطالبہ کریں جس سے کہ ان کی اقتصادی خوشحالی کی ضمانت بھی ملتی ہو۔

☆ مسلمان تاجر جدید دور کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے پیشہ وارانہ صلاحیت کے حامل حضرات کی خدمات حاصل کرنے کی عام روش اختیار کریں۔

☆ مسلمان دستکار و تاجر آپسی تال میل کے ذریعہ مشترکہ تجارتی پہل کے آغاز سے بڑی صنعت کاری کے عمل میں حصہ دار بن سکتے ہیں۔ وہ بھی اس سمت میں پہل کرنے کا اپنے اندر حوصلہ پیدا کریں۔

☆ خود کفالت اور خود انحصاری کو شعار بنانے کی ضرورت ہے۔

☆ اپنے اندر سے احساس کمتری کو دور کرنے کی ضرورت، خود اعتمادی اور جرأت

مندی کے ساتھ اعلیٰ حکومتی افسران سے ملنے اور انہیں اپنے ساتھ منصفانہ روش اختیار کرنے پر مجبور کرنے کی روش کو اپنانے کی ضرورت ہے۔

☆ متعصبانہ سلوک اور زیادتیوں کے خلاف جمہوری اور آئینی طریقے سے احتجاج اور تنقید کے حق کا استعمال کرنا چاہیے۔

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ مسلمان اگر اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لیے قرض کی فائل لے کر بینک منیجر کے پاس جاتا ہے تو پہلے نام دریافت کیا جاتا ہے اگر رام داس اور ہری پرساد ہے تو اس کو عزت و احترام سے بٹھایا جاتا ہے، اور اگر عبداللہ یا انور رضا نام ہے تو وہ فائل دیکھ کر ڈھیروں غلطیاں نکال دیتے ہیں، اور اس شخص سے ایسی گفتگو کی جاتی ہے کہ اس کا ہمت و حوصلہ پست ہو جاتا ہے۔ پھر وہ دوبارہ بینک منیجر کے پاس جانے کی ہمت نہیں کر پاتا۔ آخر یہ مسلمانوں کو اقتصادی و معاشی حالات کو کمزور کرنے کی پالیسی نہیں تو اور کیا ہے؟

نکاح وطلاق رجسٹریشن بل

ملک میں ایک ایسا طبقہ ہے جو یہ چاہتا ہے کہ جس طرح ہندو بل قانون ہے، بالکل اسی طرح مسلمانوں کے لیے ایک قانون بل پاس کیا جائے، یا پھر ایک ایسا قانون لایا جائے جو سبھی مذاہب و ادیان کے لیے یکساں ہو۔ مرکزی حکومت سے بعض ریاستوں نے یہ سفارش کی ہے کہ ایک ایسا قانون پارلیمنٹ پاس کرے جس کے ذریعہ نکاح، طلاق، جہیز وغیرہ پر کنٹرول کیا جا سکے، دراصل اس قانون کا مقصد بتائی جا رہی چیزوں پر کنٹرول نہیں ہے بلکہ اس کے پس پشت بھیانک خطرات سمجھ میں آ رہے ہیں۔ اس لئے شریعت اسلامیہ میں روز اول سے ایں دم تک ایک ضابطہ اور قانون موجود ہے۔ اب ایسی صورت میں نئے سرے سے شریعت اسلامیہ سے انحراف کرتے ہوئے قانونی بل لانا مداخلت فی الدین ہے۔ اسلامیانِ ہند کے

درمیان مروج نکاح نامہ میں دولہا، دلہن، قاضی، گواہ اور وکیل کے علاوہ مہر وغیرہ کی تفصیلی کیفیت کے خانہ میں اندراج ہوتے ہیں۔ اور سبھی کے دستخط بھی ہوتے ہیں۔ حاضرینِ مجلس میں معززین کے دستخط کرائے جاتے ہیں۔ مروج نکاح نامہ اپنے آپ میں خود رجسٹرڈ ہے اور معلومات کے اعتبار سے کافی ہے۔

ہمارے سیاست دانوں اور نوکر شاہی، دونوں کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے اندر مسائل کو حل کرنے کے مقابلے میں انہیں مزید الجھانے اور نت نئے مسائل پیدا کرنے کی اہلیت و مہارت کہیں زیادہ پائی جاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ واقعات کی روش، اس بات کی طرف بہت ہی واضح طور پر اشارہ بھی کرتی ہے کہ کچھ لوگ بہت پابندی کے ساتھ ان چیزوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ جو کسی نہ کسی طور پر اقلیتوں کے اندر بے اطمینانی پیدا کرنے اور ان میں بے چارگی کے احساس کو مزید بڑھانے میں معاون بن سکتی ہوں۔

شادیوں کے رجسٹریشن سے متعلق مرکزی قانون وضع کرنے کی تجویز اسی طرح کے لوگوں کے ذہن کی پیداوار کہی جاسکتی ہے۔ گزشتہ سال اکتوبر میں حکومت اتر پردیش کی طرف سے یہ تجویز آئی تھی کہ شادیوں کے رجسٹریشن کے لئے ایک ملک گیر قانون بنایا جائے، تاکہ انتظامیہ اور کورٹ کے پاس ہر نکاح یا شادی کا باضابطہ ریکارڈ موجود رہے۔ اور زن وشوہر کے درمیان نا اتفاقی کی صورت میں تنازعات طے کرنے میں اس سے مدد لی جاسکے۔ حکومت یوپی کی تجویز میں یہ سفارش بھی کی گئی تھی کہ رجسٹریشن کے مجوزہ قانون کے خلاف ورزی کی صورت میں نہ صرف یہ کہ رشتہ ازدواج کو غیر معتبر قرار دیا جائے، بلکہ فریقین کے خلاف قانونی کارروائی بھی کی جائے۔ یعنی مجوزہ قانون کی خلاف ورزی کو قابل مزاجرم قرار دیا جائے، اب دہلی انتظامیہ نے بھی مرکزی حکومت سے سفارش کی ہے کہ آئندہ راجدھانی میں ہونے والی تمام شادیوں کا باضابطہ رجسٹریشن ہونا چاہیے۔ اس سلسلہ میں اہل سنت وجماعت نے اپنا عندیہ بہت واضح انداز

میں حکومت ہند کے سامنے رکھ دیا ہے کہ مروجہ اندراج نکاح نامہ کے بعد اب مزید کسی رجسٹریشن کی ضرورت نہیں ہے۔ جبکہ دوسری طرف وہابی مکتبہ فکر کے لوگوں نے حکومت کے مطالبہ کو تسلیم کر لیا ہے۔ اخبارات میں حکومت کے موقف کی حمایت میں ان کے بیانات شائع ہو رہے ہیں اس ضمن میں بننے والا قانون امت مسلمہ کے لئے کتنا نقصان دہ ہے۔ اس کا اندازہ درج ذیل سطور پڑھنے پر لگایا جا سکتا ہے۔

اسلام میں نکاح

اسلام میں نکاح ایک مقدس عقد ہی نہیں بلکہ ایک مقدس روحانی غذا میں سے ہے۔ قدرت کی عظیم الشان نشانی بھی ہے۔ قرآن وسنت میں جہاں نکاح کا حکم دیا گیا ہے، وہاں اس کے قواعد وضوابط اور شرائط بھی تفصیل سے بتائے گئے ہیں۔ کس عورت سے شادی کی جائے، کس سے نہیں، کس طریقہ سے شادی ہو؟ اس کا مقصد اور نیت کیا ہو؟ غرض اس سلسلے کی کوئی چیز ایسی نہیں جو بتائی نہ گئی ہو۔ حضور اقدس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کو ایمان کا آدھا حصہ قرار دیا ہے۔ "النکاح نصف الایمان" یہ بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ نکاح میری سنت ہے اور جو شخص بھی اس سنت سے اعراض کرے گا وہ مجھ سے نہیں، تارک نکاح پر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی انتہائی ناراضگی اور خفگی صاف ظاہر ہے۔

قرآن وسنت میں جس طریقہ سے نماز وروزہ وغیرہ دیگر عبادتوں کے صحت وفساد کے ارکان وشرائط اور ضروری باتیں بتائی گئی ہیں، مثلاً نماز کی حیثیت کہ کون سی نماز فرض ہے اور کون سی واجب، کون سی سنت، کون سی نفل۔ اور نماز کے صحیح اور درست ہونے کے لئے کون کون سی باتیں لازمی اور ضروری ہیں، اور کون کون سی باتوں کے بغیر نماز منعقد ہی نہیں ہوتی، اور اگر ہوتی ہے تو کن کن باتوں سے نماز فاسد ہو جاتی ہے، یا ٹوٹ جاتی ہے۔ کون کون سی باتیں اس میں اختیاری، کون سی

باتیں لازمی، کون کون سی باتیں ممنوع ہیں۔ اسی طریقہ سے نکاح کی حیثیت واہمیت، کس حالت میں نکاح فرض، کب واجب، کب سنت اور نفل بتایا گیا ہے۔ نیز یہ بھی بتادیا گیا ہے کہ فلاں فلاں باتیں مثلاً ایجاب وقبول، مہر، گواہ لازمی اور ضروری شرائط بہت سے ہیں۔ اس کے بغیر نکاح صحیح نہیں ہوتا۔ تو کن کن صورتوں میں نکاح ٹوٹ جاتا ہے، یہ سب باتیں بتادی گئی ہیں۔ اس طرح نماز اور روزہ کے متعلق صحت وفساد، مشروع وممنوع، لازمی اور اختیاری امور میں کسی قسم کی تحریف وترمیم کی اجازت کا حق کسی کو نہیں ہے۔ اسی طرح امور نکاح میں کسی قسم کی ترمیم وتنسیخ، جبر واختیار کا حق کسی کو حاصل نہیں ہے۔ اس کو دین میں مداخلت اور دخل اندازی ہی کہا جائے گا۔

نکاح کا مقصد

اس موقع پر یہ بات بھی معلوم ہونی چاہیے کہ اسلام میں نکاح کا مقصد صرف جماع ہی نہیں ہے، جماع کے لئے تو نکاح لازمی ہے مگر نکاح کے لئے جماع لازمی نہیں ہے۔ حصول اولاد، باہمی ہمدردی، خاندانی تعلق، غریب پریشان حال یا بیوہ پر رحم، امور خانگی میں تعاون، اتباع سنت اور حصول ثواب، اصلاح نفس وغیرہ جیسے دوسرے مقاصد ہو سکتے ہیں اور اسی لئے نکاح صحیح ہو جانے کے باوجود اگر بیوی ناقابل جماع ہے تو جب تک وہ اس قابل نہ ہو جائے اسے شوہر کے پاس بھیجنے پر اس کے اولیاء نہ مجبور ہیں اور نہ شوہر یہ مطالبہ کر سکتا ہے۔ اس طریقہ سے بیوی کی صحت کے پیش نظر ایام حیض وغیرہ میں جماع اسلام میں ممنوع ہے۔

بچپن کی شادی

مجوزہ بل (پاس شدہ اسمبلی ۲۳ ستمبر ۱۹۲۹ء/ ۲۸ ستمبر ۱۹۲۹ء) کا مقصد بچپن کی شادی کی روک تھام کرنا بتایا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد سے نکاح کے لئے عمر کا تعین ضروری ہوگا۔ مثلاً یہ قانون بنایا جائے کہ شادی کے لئے لڑکے کی عمر ۲۱ اور

لڑکی کی عمر ۱۸ر یا ۲۵ر اور ۳۰ر سال کا ہونا ضروری ہے۔ اس عمر سے پہلے کی شادی قانوناً جرم اور موجب سزا ہوگی۔ اور کوئی بھی اس قانون کی خلاف ورزی کرنے نہ پائے، اس کے لئے نکاح کا رجسٹریشن لازمی کیا جا رہا ہے۔ تعین عمر اور اس قسم کا قانون بنانے سے پہلے ہمیں اس کے نفع ونقصان پر کھلے دماغ سے غور کرنا چاہیے۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ اس سے فائدہ کیا ہوگا اور نقصان کیا ہوگا۔ جہاں تک عورت کی صحت کا تعلق ہے تو وہ اس وقت اثر انداز ہوسکتی ہے جب شادی کے لئے جماع لازمی ہو، اور جماع کے سوا شادی کا کوئی اور مقصد ہی نہ ہو۔ حالانکہ یہ بات غلط ہے جیسا کہ میں نے پہلے ہی بتا دیا ہے کہ جب تک لڑکی جماع کے قابل نہ ہو جائے اسے شوہر کے پاس بھیجنا یا شوہر کا ایسا مطالبہ کرنا دونوں ہی ممنوع ہیں۔ جماع کا احتمال ہی نہ رہا تو صحت کے بگڑنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اگر محض اسی خیال سے شادی کو روکنا ہے تو ایام حیض و زچگی وغیرہ میں شادی کو توڑ دینا چاہیے، کیونکہ وہاں بھی یہ احتمال وخطرہ ہے جو بدستور موجود ہے۔ علاوہ بریں اس حقیقت سے بھی کوئی سمجھ دار انسان انکار نہیں کرسکتا کہ عورت بلکہ مرد کے بھی قابل جماع ہونے کی اور اس کی جنسی خواہشات کے ابھرنے کی کوئی عمر متعین نہیں ہے۔ اس لئے سماجی، اخلاقی اور جسمانی صحت کا تقاضہ ہے کہ شادی کے لئے کوئی خاص عمر متعین نہ کی جائے بلکہ لڑکی اور لڑکے کی صلاحیت وبلوغیت پر چھوڑ دیا جائے۔

یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ لڑکی جیسے جیسے بڑی ہوتی جاتی ہے، ماں باپ کی بے چینی بڑھتی جاتی ہے۔ شادی کی فکر ان کو دن رات پریشان رکھتی ہے۔ ایک طرف لڑکی یا لڑکے کی غلط روی کی فکر، دوسری طرف مناسب لڑکے یا لڑکی کا نہ ملنا۔ اگر مل بھی گیا تو قانون راہ میں رکاوٹ ہے کہ ابھی بچی کی عمر تیرہ چودہ سال ہے، مثلاً ابھی اس کی عمر اٹھارہ سال نہیں ہوئی اس لئے شادی نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ مزید چار سال تک پریشان رہو۔ لڑکا ملے نہ ملے، ملے تو کب ملے۔ ایسی حالت میں لڑکی کے

والدین یا گارجین کے دل و دماغ پر جو تکلیف دہ اثر پڑتا ہے وہ تو وہی بتا سکتے ہیں۔ اس لئے نہ صرف لڑکی کی صحت بلکہ اس کے ماں باپ اور گارجین کی صحت کی خاطر اس قسم کا بل لانے سے باز رہنا ضروری ہے، اور شادی کی عمر کے تعین کے بجائے اس کا حالات اور سہولت پر چھوڑ دیا جائے۔ ان حالات میں عمر کا تعین اور شادی کا رجسٹریشن نوجوان لڑکے لڑکی پر ان کے گارجین بلکہ صالح معاشرہ پر انتہائی ظلم ہے، ان کو غلط راستہ پر چلنے کے لئے مجبور کرنے کے مترادف ہے، اور ظاہر ہے کہ جو قانون جور و ظلم اور زیادتی پر مجبور کرے وہ خود مجرم ہے۔

کم عمری میں شادی کی مضرت کے متعلق یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ اگر لڑکی کے بالغ ہونے سے پہلے اس کا شوہر انتقال کر گیا، تو یہ لڑکی زندگی بھر بیوگی کی تکلیف اٹھانے پر مجبور ہوگی۔ اس لئے کہ بیوہ ہونے کا تعلق صرف کم عمری ہی سے نہیں ہے۔ بڑی عمر مثلاً ۱۸/سال کی لڑکی کے بیوہ نہ ہونے کی کوئی گارنٹی نہیں ہے۔ ایک لڑکی چھ سال کی عمر میں بیاہی جاتی ہے اور ۷۰/سال تک زندگی گزار کر شوہر کی موجودگی میں انتقال کرتی ہے۔ دوسری لڑکی ۱۸/سال کی عمر میں شادی کرتی ہے اور چند دن بعد بیوہ ہو جاتی ہے، اور ۷۰/سال تک بیوگی کی زندگی گزار کر انتقال کرتی ہے۔ ایسی حالت میں کم عمری کی شادی کو روکنا بیوگی کا علاج نہیں ہے۔ بلکہ نکاح بیوگان کو رواج دینا ہی اس کا مجرب علاج ہے۔ اس سلسلے میں یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ بچپن کی شادی میں لڑکی لڑکے کی مرضی اور خواہش کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ بلوغ اور عمر کے بعد اگر انہوں نے ایک دوسرے کو پسند نہیں کیا تو بھی اپنی مرضی کے خلاف رشتہ ازدواج سے بندھا رہنا پڑے گا۔ کیوں کہ اسلام میں ایسی حالت میں میاں بیوی کو بالکل اختیار ہے کہ ضابطہ کے تحت قاضی سے رجوع کرے اور اس نکاح کو فسخ کرادے۔ جس کو اسلام نے ''خلع'' کے بہترین لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ بل لانے والے کہہ رہے ہیں کہ تعدد ازدواج کو روکنا بھی اس رجسٹریشن کے مقاصد میں ہے۔ ضرورت اور خاص حالات

میں تعدد ازدواج سے روکنا سوسائٹی اور معاشرہ پر صریح ظلم ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ جو سماج تعدد ازدواج کا منکر اور خلاف ہے۔ وہاں بجائے منکوحہ بیوی کے داشتہ کا رواج زیادہ ہے۔ اسلام خاص حالات میں مشروط طور پر تعدد ازدواج کی اجازت دیتا ہے۔ اس کے باوجود یہ بھی واقعہ ہے کہ مسلمانوں کے مقابلہ میں غیر مسلموں میں تعدد ازدواج کا تناسب زیادہ ہے۔ نیز تعدد ازدواج سے فرار اور داشتہ کا رکھنا جہاں متمدن معاشرہ میں جرم ہے وہاں عورت پر بھی ظلم ہے۔ بیوی کی حیثیت سے عورت کے حقوق سے فرار ہی کا جذبہ دوسری شادی نہ کرنے اور داشتہ رکھنے کا سبب ہے۔ شریعت اسلامیہ نے ایسے مجرم شخص کے لئے سخت ترین حکم دیا ہے۔ یہ بات مسلم مخالف نظریہ کے حامل افراد کہتے ہیں کہ اسلام نے چار شادیوں کی اجازت دے کر مسلم شماری کو بڑھاوا دیا ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے مخالف اسی فارمولے کو اپنا کر نفس پرستی اور عیاشی کا ذریعہ بنائے ہوئے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ اعتراض بیجا ہے۔

ضبط تولید

شادی کے جبری اور لازمی رجسٹریشن کے مقاصد اور اغراض میں تولید پر کنٹرول اور قابو پانا بھی بتایا جاتا ہے۔ حالانکہ جو مغربی عینک اور مغربی پروپیگنڈہ مشینری کی آنکھ سے نہیں بلکہ اپنی خداداد بینائی اور بصیرت سے غور کرتے ہیں، اس کے نزدیک ضبط تولید کا منصوبہ اور اس کی بنیاد ہی غلط ہے۔ اگر اس کی بنیاد صحیح ہوتی اور اٹھارہویں صدی کے آخری دور سے کثرت آبادی کے متعلق دانشوروں نے جو خطرہ کی گھنٹی بجانی شروع کی تھی اگر وہ واقع ہوتا تو آج روئے زمین پر انسان تو انسان تل دھرنے کی جگہ بھی نہ ملتی اور کسی کو ایک دانہ بھی کھانے کو نہ ملتا۔ ضبط تولید کے متعلق یہ راز بھی قابل غور ہے کہ فیملی پلاننگ کا سارا زور ترقی پذیر ملکوں ہی میں کیوں لگایا جا رہا ہے۔ جب کہ ترقی یافتہ ممالک کثرت تولید کی حوصلہ افزائی کرتے

اور اس پر انعامات بھی دیتے ہیں ۔ بات یہ ہے کہ عددی طاقت عسکری طاقت پر بھاری ہے ، جو ایک مسلم حقیقت ہے ، اور تجربہ بھی ہے ، ترقی یافتہ ملکوں کے پاس عددی طاقت کی کمی ہے ۔ اس لئے ترقی یافتہ ملکوں کو اس بات کا خطرہ ہے کہ ترقی پذیر ممالک کی عددی طاقت اگر بڑھتی گئی تو وہ اپنی عسکری میں کثرت آبادی کے لئے کوشش اور حوصلہ افزائی کر رہے ہیں ، دوسری طرف ترقی پذیر ملکوں پر ضبط تولید کے لئے دباؤ ڈالتے رہتے ہیں ، تاکہ یہ ترقی پذیر ممالک عددی اور عسکری دونوں اعتبار سے ان کے دربار کے محتاج رہیں ۔ درحقیقت جن خطروں اور اندیشوں کی بنا پر ضبط تولید کا منصوبہ اور کوشش ہے ، وہ یا تو بالکل فرضی ہے یا معمولی درجہ کا ہے ۔ اصل راز عددی اور عسکری طاقت کا توازن اور مقابلہ ہے ۔ ہمارے ملک عزیز میں اکثر یہ آواز فرقہ پرستوں کی طرف سے اٹھتی رہتی ہے کہ مسلمان بہت بچے پیدا کر رہے ہیں ۔ اور دوسرے طبقہ کے لوگ صرف ایک یا دو پر اکتفا کر لیتے ہیں ۔ اس سے ہندوستان ۲۵ رسال بعد مسلم ملک بن جائے گا ۔ جبکہ یہ سب غیر مسلموں پر خوف طاری کرنے کے علاوہ کچھ نہیں ہے ، بلکہ وہ مسلمانوں کا خوف دکھا کر اپنے طبقہ کا خوب استحصال کر سکیں ۔

تکثیر اولاد

اسلام میں ضبط تولید کی اجازت بالکل نہیں ہے ، بلکہ تکثیر اولاد کا حکم ہے ۔ حضور اقدس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے تناکحوا وتکاثروا یعنی تم شادی کرو اور اولاد پیدا کرو ۔ ترمذی شریف میں یہ حدیث موجود ہے ، اس لئے ضبط تولید اور اس مقصد سے رجسٹریشن صریح مداخلت فی الدین اور حکم نبوی کے مغائر ہے ۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جگہ فرمایا کہ مجھے میری امت کی تکثیر پر قیامت کے دن فخر ہوگا ۔

اجنبی مرد وعورت

کہا جاتا ہے کہ نکاح کا رجسٹریشن لازمی ہوجانے سے کوئی مرد یا عورت

نکاح سے انکار نہیں پائیں گے۔ وہیں غلط دعویٰ کر کے ایک دوسرے کے حقوق کا مطالبہ بھی نہیں کر پائیں گے۔ جس قوم یا سوسائٹی میں داشتہ کا رواج ہے اور اس کو عیب تصور نہیں کیا جا سکتا، صرف کبھی کبھی مسئلہ پیدا ہو سکتا ہے کہ داشتہ عورت اس قسم کا دعویٰ کرے۔ ظاہر ہے داشتہ کا رکھنا بجائے خود ایک جرم ہے اور زنا کاری اور عصمت دری ہے، اس لئے نکاح کے رجسٹریشن کے بجائے اس غلط طریقہ کا سد باب کرنا چاہیے۔ رجسٹریشن اس کا علاج نہیں ہے، بلکہ لوگوں کے اندر اس فعل بد کا احساس پیدا کرنا، ضرورت اور حالات کے مطابق دوسری شادی کی اجازت دینا ہی اس کا واحد علاج ہے، اور اسی میں عورت کے حقوق اور عصمت کا تحفظ ہے۔ ورنہ جو لوگ بیوی کے حقوق سے فرار اختیار کرنا چاہتے ہیں وہ کب داشتہ سے نکاح کرنا چاہیں گے، بلکہ وہ تو نفس نکاح ہی سے گریز کریں گے اور اپنی خواہشات کی تکمیل کرتے رہیں گے۔

قوم اور معاشرہ کے علاوہ لاکھوں میں بھی آپ کو ایک واقعہ ایسا نہیں ملے گا کہ ایک شخص نے نکاح کے رجسٹریشن نہ ہونے کی صورت میں نفس نکاح سے ہی انکار کیا ہو، اور اپنی بیوی کو بیوی نہ مانتا ہو۔ اسی طرح لاکھوں میں ایک واقعہ بھی خاص طور پر مسلمانوں میں ایسا نہیں ملے گا کہ کسی اجنبی مرد نے اجنبی عورت یا کسی اجنبی عورت نے کسی اجنبی مرد پر اپنی بیوی یا اپنا شوہر ہونے کا دعویٰ کیا ہو۔ اگر ایک دوسرے پر باہمی اعتماد اتنا ہی کمزور ہے تو انہیں اختیار ہے کہ رجسٹریشن کرائیں۔ کون ان کو روکتا ہے، ساری دنیا کو اس کے لئے مجبور کرنا کون سا طریقہ اور اقدام ہے۔ اگر اتفاق سے کسی نے رجسٹریشن نہیں کرایا اور بعد میں اختلاف ہوا یا کسی کے حقوق پر اثر انداز ہوا تو یہ ان کا اپنا قصور ہے۔ اپنی بے احتیاطی ہے جو ان کو نقصان ہوا۔ دوسروں کو پریشان کرنے کی کیا وجہ ہے۔ یہ تو مدعی سے گواہ چست والا معاملہ ہے۔ اس قسم کے اختلافات اور جھگڑے کیا صرف نکاح ہی میں محدود ہیں۔ سماج اور کورٹوں میں کیا ہزاروں معاملات اس قسم کے نہیں ہیں جن کا تعلق نکاح سے نہیں، تو

کیا ہر معاملہ کے فیصلہ اور سنوائی کے لئے ضروری ہے، کہ وہ معاملہ کی رجسٹری لازمی قرار دی گئی ہو۔ کیا کورٹ، کسی معاملہ، مقدمہ دائر کرنے اور اس کا فیصلہ حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے، کہ وہ معاملہ پہلے رجسٹرڈ ہو۔ نیز معاملات کا ثبوت کیا صرف رجسٹریشن پر موقوف ہے اور جہاں معاملہ پہلے سے رجسٹرڈ نہیں ہے، وہاں کورٹ میں مقدمہ ہی پیش نہیں ہوسکتا؟ یا دیگر شہادت سے اس کا فیصلہ نہیں ہوتا؟ ہزاروں اور لاکھوں معاملات ومقدمات کا فیصلہ رجسٹریشن کے بغیر ہی ہوتا رہتا ہے۔ کورٹ میں ان کی پیشی اور ان کی سنوائی اور ان کے فیصلے رجسٹریشن کے اوپر موقوف نہیں ہیں، اور نہ ان کا رجسٹریشن ہونا قانوناً جرم قرار دیا جاتا ہے، اور نہ یہ کہہ کر ان کا مقدمہ واپس کیا جاتا ہے کہ تم نے اپنا معاملہ رجسٹریشن نہیں کرایا ہے اس لئے یہ مقدمہ کورٹ میں دائر نہیں ہوسکتا۔ بلکہ تم خود مجرم ہو کہ رجسٹریشن نہیں کرایا، اس لئے تم کو سزا دی جائے گی۔ تو پھر ایک ہی نکاح کے معاملہ کو کیوں اس کے لیے منتخب کیا گیا؟ کیا نکاح کے علاوہ عورتوں کی زمین جائیداد اور دیگر معاملات کے فیصلے کورٹ میں نہیں ہوتے؟ اس لئے کہنا پڑتا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ اس کا مقصد عورتوں کے حقوق کا تحفظ یا مذکورہ بالا یعنی ایک دوسرے پر شوہر بیوی ہونے کے دعوے کے سد باب کا دعویٰ محض دعویٰ ہے، اور اس کا مقصد کچھ اور ہی ہے۔

کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں

بنیادی حقوق کی پامالی

ہر قوم ومعاشرہ میں صدیوں بلکہ ہزاروں سال سے شادی ایک اہم فریضہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے لئے اپنا اپنا طریقہ بھی ہے، اور اس کی سختی سے پابندی چلی آرہی ہے۔ دستور ہند نے بنیادی حقوق اور تہذیب وتمدن کی حفاظت اور اس میں مداخلت نہ کرنے کی ضمانت دی ہے۔ نکاح کے رجسٹریشن کے نام پر ان کی مرضی کے خلاف اس میں دخل اندازی اور شرائط عائد کر کے اس طرح کی دشواریاں اور رکاوٹیں پیدا کرنا، اس کے اس

بنیادی حق کی پامالی اور دستور کی توہین ہے، دی ہوئی ضمانت کی خلاف ورزی بھی ہے۔

مداخلت فی الدین

دستور ہند میں مسلم پرسنل لاء میں دخل اندازی نہ کرنے اور اس کے تحفظ کی جو ضمانت دی گئی ہے مجوزہ بل اس ضمانت کی صریح خلاف ورزی اور مداخلت فی الدین ہے۔ جب کہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ اسلام میں دیگر عبادات کی طرح نکاح میں بھی سارے شرائط اور لوازمات تفصیل کے ساتھ موجود ہیں۔ لازمی اختیاری امور میں سے کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جو قرآن وسنت میں موجود نہ ہو۔ ان حالات میں ان امور میں کسی قسم کی کمی بیشی، ترمیم وتنسیخ کی گنجائش نہیں اور نہ کسی کو ہونا چاہیے، وہ مسلمان حاکم ہی کیوں نہ ہو، ایسا کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی ہے۔ اللہ اور اس کے رسول کے بیان وقضا کے بعد کسی مومن ومومنہ اور مرد وعورت کو اس میں کسی قسم کی مداخلت کی گنجائش نہیں ہے۔ اسلام میں نکاح کے لئے اب کوئی عمر متعین نہیں ہے۔ بلکہ پیدا ہونے سے لے کر موت تک اس کا وقت ہے، اس لئے کسی عمر میں کسی بھی وقت مسلمان، مرد وعورت کو شادی کا مذہبی اختیار حاصل ہے، اور جس طریقہ سے نماز کے لئے مقررہ وقت کے کسی بھی حصہ کو لازمی قرار دینا اور اس میں نماز پڑھنے پر مجبور کرنا، اسے آگے پیچھے تقدیم وتاخیر کا اختیار سلب کرنا ناجائز اور مداخلت فی الدین ہے۔ اسی طریقہ سے شادی کے لئے کوئی عمر متعین کر دینا اس سے آگے پہلے یا بعد میں شادی کرنے یا نہ کرنے پر مجبور کر دینا بھی مداخلت فی الدین ہے۔ اس پر علماء وفقہاء کی بے شمار آرا اور اسلامی قوانین کتب فقیہہ میں مل جائیں گے۔

مسلم مردم شماری پر شور وغوغا

حالیہ مردم شماری کی روشنی میں کچھ انتہا پسند لوگوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ ''ہندوستان میں مسلم اقلیت جس رفتار سے اپنی تعداد بڑھا رہی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا

کہ ۲۰۲۵ تک مسلمان اکثریت طبقہ بن کر اس ملک میں حکومت کرنے لگیں گے'' یہ بلاشبہ ایک مضحکہ خیز بات ہے اور اکثریتی طبقہ کو خوف میں مبتلا کرنے اور ڈرانے کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ جبکہ ایسے لوگوں کو خود اپنے گھر میں جھانک کر دیکھنا چاہیے کہ ہمارے سماج کا کیا حال ہے۔

عام طور پر جب کبھی مردم شماری کی رپورٹ منظر عام پر آتی ہے، تو پہلی تشویش بڑھتی ہوئی آبادی پر ظاہر کی جاتی ہے، اور پھر زوردار انداز میں یہ ثابت کرنے کی کوشش ہوتی ہے کہ ''اگر آبادی اس رفتار سے بڑھتی رہی تو ایک وقت ایسا آئے گا، جب تمام وسائل ختم ہو جائیں گے۔ اور انسان بنیادی ضروریات سے بھی محروم ہو جائے گا''۔ یہ صورت حال کا عمومی جائزہ ہے۔ اگر اس کا اس طرح سے جائزہ لیا جائے کہ آزادی کے بعد سے آج تک گزشتہ ۵۷ سالوں میں جس رفتار سے ملک کی آبادی میں اضافہ ہو رہا ہے اس سے کہیں زیادہ سرعت سے وسائل حیات بڑھ رہے ہیں۔ ۱۹۵۰ء میں ہمارا ملک لوہے کی ایک بھی چیز بیرونی ممالک سے درآمد نہیں کرتا تھا۔ آج حال یہ ہے کہ ہمارے ممالک سے ریلویز بوگیز دوسرے ملکوں کو برآمد کی جارہی ہیں۔ سافٹ ویر ایکسپورٹ میں ہمارا ملک صف اول کے ممالک میں شمار کیا جانے لگا ہے۔ سائنس وٹیکنالوجی کے میدان میں بھی غیر معمولی ترقی ہوئی ہے۔ آج ہندوستان ایک جدید توانائی طاقت ور ملک بن گیا ہے۔ لیکن دوسری طرف یہ حقیقت ہے کہ ملک کی آبادی کا ایک بڑا حصہ آج بھی خط غربت سے نیچے زندگی گزار رہا ہے۔ ملک کی نصف آبادی سے زائد ناخواندہ قومیں ہیں۔ کیا اس کی وجہ بڑھتی آبادیاں اور وسائل حیات کی قلت ہے، یا اصل مسئلہ ملک کی غلط اقتصادی پالیسی کا ہے۔ حکومت چاہے جس کی ہو مگر عوام دشمن پالیسیوں کے میدان میں یکساں ہے۔

مردم شماری کی رپورٹ میں صوبہ کشمیر و آسام کی سالانہ شرح کو شامل کیا گیا ہے، جس کی وجہ سے مسلمانوں کی آبادی بڑھتی نظر آئی، جب کہ یہ ۱۹۸۱ء اور ۱۹۹۱ء

کے اعداد وشمار سے کشمیر وآسام صوبہ مستثنیٰ تھے، اور دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ ہندوؤں میں بیوہ عورت کی شادی کا رواج نہیں ہے۔ اگر چہ یہ ہندو مذہب کی تعلیم نہیں ہے، مگر رواجی طور پر وہ ہندو معاشرہ کا اتنا گہرا حصہ بن گیا کہ بیوہ ہونے کے بعد شاید ۹۹ فیصد سے زیادہ ہندو عورتوں کو غیر شادی شدہ زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ دوسری طرف مسلمانوں میں بیوہ کی شادی کا عام رواج ہے، بیوہ کی شادی کے بارے میں کوئی منفی عقیدہ ونظریہ مسلمانوں میں پایا نہیں جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندو عورت کے یہاں بیوہ ہونے کے بعد پیدائش کا عمل رک جاتا ہے، اور دوسری طرف مسلمانوں میں بیوہ ہونے کے بعد نئے نکاح کی مدت میں پیدائش کا عمل بدستور جاری رہتا ہے۔ بیوہ سے شادی کرنا سنت رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے۔ دوسری بات ہندو سماج میں لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان تفریق وامتیاز کا معاملہ ہے۔ یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو چکی ہے کہ ہندوؤں میں بڑے پیمانے پر حمل کے بعد وہ حاملہ عورت الٹرا ساؤنڈ کرواتی ہے، اور اگر اس جانچ سے یہ معلوم ہوا کہ حاملہ کے پیٹ میں لڑکی ہے تو جدید تکنیک مونو گرین کے ذریعہ حمل کو ضائع کرادیا جاتا ہے۔ ایک تجزیہ کے مطابق ہندوؤں میں لڑکوں کی بہ نسبت لڑکیوں کی تعداد کم ہوتی جارہی ہے۔ جبکہ اسلام اسقاط حمل کی اجازت نہیں دیتا۔ اور مسلمان بالعموم اس نظریہ پر عمل بھی کرتا ہے۔ اور معاشرہ میں معیوب بھی سمجھا جاتا ہے۔

مسئلہ مردم شماری کا نہیں بلکہ مجموعی حیثیت سے یہ ہے کہ مسلمان سب سے زیادہ پس ماندہ قوم ہے۔ مسلمانوں میں مستقل گھٹتی تعلیم، معاشی بدحالی، اقتصادی پسماندگی ودیگر صورت حال اور روزگار میں برائے نام شرکت سے متعلق اعداد وشمار منظر عام پر نہیں لائے جاتے۔ مسلمانوں کا پسماندہ ہونا ملک کے لئے تشویشناک ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ تعلیمی، معاشی اور اقتصادی پس ماندگی کے لئے حکومت کو پالیسی بنانا چاہیے، اور سرمایہ دار مسلمان بھی ان پہلوؤں پر غور کر کے کوئی لائحہ عمل واضح کریں، اور اس کو عملی جامہ پہنانے کی طرف توجہ دیں۔ تاکہ اسلامیان ہند کی پس ماندگی

کا معقول علاج ہو سکے۔ اگر مخلصانہ کوششیں کر لی جائیں تو کوئی مشکل مسئلہ نہیں ہے۔

بحیثیت مسلمان ریزرویشن

آندھرا پردیش میں صوبائی الیکشن سے قبل کانگریس نے وعدہ کیا تھا کہ اگر حکومت ہماری بنتی ہے تو مسلمانوں کو ریزرویشن دیا جائے گا، حکومت بھی کانگریس کی بن گئی۔ وعدہ پورا کرنے کے لئے چھ فیصد مسلمانوں کو ریزرویشن دینے کا اعلان کر دیا گیا۔ مگر اس سلسلہ میں جو قانونی خامیاں تھیں اس کو پورا نہیں کیا گیا، اور دستوری تیاری کے بغیر اعلان کر دینے سے ملک کی فرقہ پرست طاقتیں شور وغل مچانے لگیں۔ قابل غور بات یہ ہے کہ وشو ہندو پریشد اور بعض عناصر نے مداخلت کر کے کچھ ایسی شقیں پیدا کیں جن سے ریزرویشن کے مسئلہ میں بے شمار پیچیدگیاں ہو گئیں۔ اس کے باعث ریزرویشن کی دفعات (۶)۔۱۵(۶)۔۱۶۔۱۶۔۳۳۵۔ اور ۳۴۱ تقریباً غیر موثر ہو کر رہ گئیں۔ ظاہر ہے کہ مندرجہ بالا قانونی دفعات سے محض اقلیتوں کو مستفیض کرنے کے خیال سے وضع کی گئی تھیں۔ اور یہ بات بھی شبہ سے بالاتر ہے کہ شناخت ''مذہب'' ہی کے ذریعہ ممکن ہو سکتی ہے نہ کہ معاشی بدحالی اور تعلیمی پسماندگی سے، اس سلسلہ میں قانون ساز ادارے، اسمبلی اور پارلیمنٹ مکمل سکوت اختیار کئے ہوئے ہیں۔ جبکہ عدل وانصاف کے ساتھ شفافیت لانا از حد ضروری ہے۔ چونکہ ہندوستانی سماج میں ۸۰ فیصد افراد معاشی اور تعلیمی حیثیت سے مفلس اور قلاش نظر آتے ہیں۔ اور اگر دوسرے زاویہ نگاہ سے دیکھیں تو ملک کے تمام شہریوں کے مساویانہ حقوق کو تسلیم کر لینے کے بعد مرکزی وریاستی حکومتوں کا فرض ہے کہ وہ مسلمانوں کے سلسلہ میں عدل وانصاف کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے انہیں ریزرویشن فراہم کریں، ورنہ جمہوریت کے حقیقی معنی کی نہ صرف صورت ہی بگڑ جائے گی، بلکہ مروجہ عدلیہ کی آبروریزی پر حرف آئے گا۔ پھر دنیا ملک کی جمہوری قدروں کی تضحیک کرنے سے نہیں چوکے گی، کیوں کہ مسلمانوں کا مذہبی تشخص کے ساتھ پہچان کر کے ان کو

ریزرویشن سے محروم کرنا جمہوریت کے سراسر منافی ہے۔

مسلمانوں سے تعلیمی وعدے

مرکزی حکومت نے اقلیتوں سے وعدہ کیا تھا کہ ان کے تعلیمی اداروں کا الحاق مرکزی یونیورسٹیوں سے کرنے کے لئے ''اقلیتی تعلیمی کمیشن'' تشکیل دیا جائے گا، بالآخر یہ کمیشن وقوع پذیر بھی ہوگیا۔ مگر اس کی عملی شکل اختیار کرنے میں بل کے اندر اکثر خامیاں موجود ہیں۔ اس سے نہ تو اقلیتوں کو کوئی فائدہ ہوگا، اور نہ اقلیتی اداروں میں اقلیتوں کو دی جانے والی مراعات ہی سودمند ثابت ہوں گی۔ پارلیمنٹ میں پیش کئے گئے بل میں داخلوں میں ریزرویشن، مالی حالت، اور دوسرے مسائل کے حل کرنے کی تجاویز شامل نہیں ہیں۔ یہاں تک کہ ایکٹ کی دفعہ (۲) کے تحت مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جیسے ادارہ کو بھی شامل نہیں کیا گیا ہے۔ مرکزی اقلیتی تعلیمی کمیشن میں انہیں لوگوں کو ممبرشپ دی گئی ہے، جو لوگ ایک مخصوص مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ مرکزی حکومت کو اس بات کا خصوصیت سے دھیان دینا ہوگا کہ ۸۰ر فیصد اہل سنت و جماعت کو ان کی آبادی کے تناسب سے اقلیتی اداروں میں نمائندگی ملنی چاہیے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ساتھ یہاں تک سلوک کیا گیا کہ اقلیتی کردار ختم کردیا گیا، جس پر راقم السطور نے علی گڑھ کے کنیڈی ہال میں سخت احتجاج کیا ہے۔ اس احتجاجی تقریر میں اتنا ضرور ہوا کہ انسانی حقوق وزرات نے وائس چانسلر سے بات کی اور یقین دلایا کہ مزید ایسا نہیں ہونے دیا جائے گا۔ اور اقلیتی کردار بحال کیا جائے گا۔

ایک مسلم وزیر کا شریعت مخالف بیان

اسلام دشمن طاقتیں اسلام مخالف بیانات کے لئے ہر طرح کے ذرائع و وسائل کا استعمال کررہی ہیں۔ کبھی وہ آر۔ ایس ایس کی شکل میں اور کبھی دوسری فرقہ پرست تنظیموں کی شکل میں، اور کبھی مسلم کا لبادہ اوڑھ کر۔ مگر خود اپنے آپ کو مسلمان کہلانے

والے اور مسلمانوں کی مسیحیت کا دعویٰ کرنے والے اتر پردیش حکومت کے ایک کابینہ مسلم وزیر وحج کمیٹی اتر پردیش کے چیئر مین نے ۳؍اکتوبر ۲۰۰۵ء کو جامع العلوم فرقانیہ مسٹن گنج رامپور میں ایک تقریر کی تھی۔ اس پر میڈیا میں غیر ضروری بحث چھڑ گئی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اصل بات سامنے آئے اور یہ سلسلہ ختم ہو جائے۔ کہ جو در حقیقت ان کی کہی ہوئی بات عوام کے سامنے آجانے پر جو علمائے اہل سنت نے حکم نافذ کیا، اس کی صورت حال سمجھ میں آجائے گی۔

ریاستی کابینہ وزیر سے پہلے ایک عالم مولانا خلیل احمد نقشبندی شیخ الحدیث جامعہ نظامیہ حیدر آباد نے تقریر فرمائی تھی، انہوں نے ایک حدیث پڑھی تھی جس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حافظ کی فضیلت بیان فرمائی ہے، جس کا حاصل یہ تھا کہ ''حافظ قرآن کے گھر کے دس ایسے افراد بخشے جائیں گے جن پر جہنم واجب ہو چکی ہوگی'' مولانا نقشبندی نے اپنی تقریر میں دوسری بات یہ کہی تھی کہ ''قرآن شریف کو ناپاک لوگ ہاتھ نہ لگائیں''۔ اس پر کابینہ وزیر نے اپنی تقریر میں کہا:

''میرے خیال سے قرآن وحدیث میں ایسا نہیں ہوگا''۔ علماء نے اضافہ کیا ہے۔ بعینہ یہ الفاظ تقریر میں موجود ہیں۔ اور میں نے کیسٹ سنی ہے اور کیسٹ میرے پاس موجود ہے۔ اس کے بعد مدرسہ فرقانیہ کے شیخ الحدیث مولوی محبوب علی شمسی وجیہی نے کہا کہ ''یہ حدیث صحیح ہے۔ اور آیت مبارکہ کا جو مفہوم مولانا نے پیش کیا وہ درست ہے۔ بھائی میں دونوں سے معافی چاہتا ہوں''۔ اس پر وزیر موصوف خاموش رہے۔ نہ انہوں نے توبہ کی نہ مولوی صاحب نے توبہ کرائی۔ دیوبندی شہر قاضی مولوی خوشنود میاں بھی وہاں موجود تھے، انہوں نے بھی کوئی حکم شرعی بیان نہیں کیا۔ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا کہ مولوی صاحب نے اتنی بات بھی مولانا خلیل احمد نقشبندی کے ایکشن پر کہی، اور پھر معافی بھی چاہ لی۔ جب کہ جو حکم وزیر موصوف پر عائد ہوتا ہے وہی حکم جلسہ منعقد کرنے والوں پر بھی عائد ہوتا ہے، جس حدیث شریف

کے ہونے سے وزیر موصوف نے انکار کیا اور اس پر اپنے خیال وفکر کو ترجیح دی ہے، سب سے پہلے حدیث شریف کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں:

عن علی قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وسلم من قرء القرآن فاستحفظہ فاحل حلالہ و حرم حرامہ وشفعہ فی عشرۃ من اھل بیتہ کلھم قد وجبت لھم النار۔ (مشکوٰۃ شریف ص: ۱۸۷)

ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آقا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے قرآن پڑھ کر حفظ کرلیا، اور اس کے حلال کو حلال اور حرام کو حرام جانا۔ اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل فرمائے گا اور اس کو اس کے اہل خاندان میں دس ایسے لوگوں میں شفاعت کا اختیار دے گا جن پر جہنم واجب ہوچکی ہوگی۔ اس کو امام احمد الترمذی، ابن ماجہ الدارمی نے روایت کیا ہے"۔

وزیر موصوف نے اس حدیث کو اس لئے قبول نہیں کیا جیسا کہ انہوں نے آگے تفصیل سے بیان کیا ہے کہ "یہ لوگ بدعمل ہوں گے اور بدعملی کی بخشش ان کے خیال میں نہیں ہونی چاہیے"۔ (کیسٹ تقریر)

ان جملوں سے دو باتیں لازم آتی ہیں:

(۱) اپنے خیال کو قرآن وحدیث پر فوقیت دینا اور یہ نہایت خطرناک قسم کی جرأت ہے اور جس کو ایک سچا مسلمان کر ہی نہیں سکتا۔

(۲) دوسرا ان آیتوں کا ضمنی انکار جن میں گنہگاروں کی مغفرت کا ذکر ہے۔

" ان اللّٰہ لا یغفر ان یشرک بہ ویغفر مادون ذٰلک لمن یشاء"

(پ ۵، ع، آیت ۴۸، سورہ نساء)

"بے شک اللہ اسے نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ کفر کیا جائے اور کفر سے نیچے جو کچھ ہے جسے چاہے معاف فرمادیتا ہے"۔

ان کو شبہ یہ لاحق ہوا کہ بدعملوں کو بخشش مل گئی تو عمل کون کرے گا۔ تو اصل

کلام میں یہ مغفرت بھی مشیت الٰہی پر موقوف ہے۔ جس کی تفصیل عقائد وعلم کلام کی اعلیٰ کتابوں میں موجود ہے۔ یہ شبہ خوارج اور معتزلہ نے بھی پیش کیا تھا اور اس کا جواب علماء وفقہاء اور محدثین نے پرزور انداز میں دیا ہے۔

کابینہ وزیر کی اس جرأت سے تکلیف یہ ہوئی ہے کہ انہوں نے یہ باتیں علماء کے درمیان دستار بندی کے جلسہ میں کہیں، اور اپنی تقریر میں پورے طور پر زور دے کر کہا۔ اس سے تمام مسلمانوں کی دل آزاری ہوئی ہے۔ اس پر حکم کیا مرتب ہوگا ، اس کا فیصلہ مفتیان کرام کریں گے۔ مگر یہ بات نہایت خطرناک ہے۔ اس کو عام مسلمان بھی جانتا ہے کہ ہر وہ شخص جس کے دل میں ایک حبہ بھی ایمان موجود ہے، وہ اس شوخ چشمی اور جرأت بے جا پر تڑپ گیا ہوگا۔

دوسری بات جو انہوں نے اپنے پیش رو مقرر مولانا خلیل احمد نقشبندی سے اختلاف کرتے ہوئے کہی تھی کہ مولانا موصوف نے کہا تھا کہ "قرآن یعنی مصحف شریف کو پڑھنے کے لئے غسل اور چھونے کے لئے وضو شرط ہے۔ بلا وضو اس کا چھونا حرام ہے"۔

کہ آیت میں فرمایا گیا ہے: "لا یمسه الا المطهرون"

(پ ۵ ،ع، آیت، ۴۸، سورہ نساء)

"اسے نہ چھوئیں مگر باوضو"

اس پر وزیر موصوف نے اپنی تقریر میں کہا:

اس میں اتنی سختی نہ ہو کہ لوگ اسے ہاتھ لگانے سے ڈریں۔ میرے خیال سے اس حکم میں تھوڑی سی نرمی کرنی چاہیے۔ ہم جیسے گنہگاروں کے لئے، ورنہ ہم تو کلام پاک کو ہاتھ بھی نہیں لگائیں گے۔ اگر غیر مسلم کلام پاک کو دیکھے گا اگر وہ باوضو نہیں ہے تو اس کو مطالعہ کرنے کا حق کیسے ہوگا۔ کیوں کہ کلام پاک صرف ہمارے لئے نہیں بلکہ تمام عالم انسانیت کے لیے آیا ہے اس لئے نرمی وترمیم ہونا چاہیے"۔ (کیسٹ تقریر)

تمام امت کے فقہاء ومحدثین کا اتفاق ہے اور خصوصاً احناف کا کہ بغیر غسل

قرآن کو پڑھنا اور بلا وضو چھونا حرام ہے۔ اس کا ثبوت سورہ واقعہ کی اس آیت سے ہے جو کہ مکہ میں نازل ہوئی تھی۔ اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی لوگوں کو لکھا بھی دیا تھا، جو تعلیم و تربیت کے لئے باہر تشریف لے گئے تھے کہ قرآن پاک کو طاہر (پاک) ہی ہاتھ لگائیں۔ ان احادیث کو ابن کثیر نے اسی آیت کو تفسیر کے تحت ذکر کیا ہے۔ قرآن کہے کہ اس کو بے وضو نہیں چھوا جائے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم حکم دیں کہ بلا وضو نہ پکڑا جائے، تمام امت کا اتفاق کہ بلا وضو نہ تھاما جائے۔ یعنی مسئلہ قرآن و حدیث اور اجماع امت سے ثابت ہے۔ ایسے مسئلہ کو بدلنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ حکم قرآن اور فرامین نبوی میں نرمی اور ترمیم کی بات آج سے بارہ سال قبل سلمان رشدی نے بھی کی تھی، تو علمائے اہلسنت نے سلمان رشدی کا سر قلم کرنے کا فتویٰ جاری فرمایا تھا۔ ایسی جرأت آج تک کسی غیر مسلم نے بھی نہ کی جو وزیر موصوف کر رہے ہیں۔ ان باتوں کو سن کر غیرت مند مسلمان کا کلیجہ منہ کو آتا ہے، پوری امت مسلمہ کا سر اسلام دشمن طاقتوں کے سامنے شرم سے جھک جاتا ہے، کہ غیر مسلم اگر قرآن پاک اور حدیث نبوی میں تبدیلی کی بات کرے تو یہ کہا جائے گا کہ وہ اسلام کا دشمن ہے، مگر یہ کیسے مسلم وزیر ہیں کہ قرآن و حدیث میں نرمی و ترمیم کی بات کر رہے ہیں؟ وزیر موصوف کے بیانات سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مسلم دشمن طاقتوں کے آلۂ کار بن کر کام کر رہے ہیں۔

مزید ان کے بیان کا شرعی حکم ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب ایمان لانے کو تھے، تو انہوں نے اپنی بہن سے حٰمٓ سورہ کی آیتیں مانگیں، بہن نے فرمایا بغیر غسل اس کو چھو نہیں سکتے۔ یعنی مکہ شریف میں تھوڑے سے مسلمان بھی اس مسئلہ سے واقف تھے کہ قرآن کو چھونے کے لئے وضو کرنا چاہیے، اس میں ایک بڑی مصلحت ظاہراً بھی ہے۔ اس سے ذہن یکسو ہو جاتا ہے، اور غور و خوض میں آسانی ہو جاتی ہے۔ جو قرآن کے معاملہ میں مددگار ہے۔ مگر اس وزیر کو اصرار ہے کہ وہ اس کو بلا وضو ہی پڑھیں گے۔ اور بلا وضو ہی

پڑھوائیں گے۔ یہ ناپاک عزائم کبھی بھی پورے ہونے والے نہیں ہیں۔ اب غیر مسلم کو قرآن کیسے پڑھوایا جائے، اس کا طریقہ بھی علمائے کرام وفقہائے عظام نے سمجھا دیا ہے، دیکھئے: عالمگیری میں ہے:

"قال ابو حنیفة رحمة الله تعالیٰ اعلم النصر انی الفقه والقرآن لعله یهتدی ولا یمسی المصحف ان اغتسل ثم لا بأس کذا فی الملتقط" (ص ۳۲۳)

امام اعظم نے فرمایا کہ میں نصرانی کو قرآن پڑھاتا ہوں اور فقہ بھی، اس امید میں کہ وہ ہدایت پاجائے۔ اور وہ مصحف کو نہیں چھوتا، ہاں اگر وہ غسل کرلے پھر چھوئے تو اس میں کوئی مضائقہ بھی نہیں۔

لیجئے خود وزیر موصوف کے شبہ وخیال کا جواب بھی ہوگیا کہ غیر مسلم کو قرآن کیسے پڑھایا جائے۔ ہاں جو غیر مسلم قرآن پڑھتا ہے حقیقت کی تلاش میں اور اس کو آداب معلوم نہیں تو اس کو کوئی سزا نہیں ہے۔ کیوں کہ وہ ابھی ایمان سے پہلے ان آداب کا مکلّف نہیں۔ اس لئے اس پر کوئی حکم شرعی وارد نہ ہوگا مگر مسلمان پر حکم نافذ ضرور ہوگا۔

بہر حال فقہا کرام نے تبلیغ کے انداز، تعلیم قرآن اور مسائل کو پوری تفصیل سے بیان فرمایا ہے، مگر اس کو معلوم کرنے کی وزیر موصوف نے ضرورت نہیں محسوس کی بلکہ مولانا خلیل احمد نقشبندی سے مسئلہ بدلنے کی درخواست کردی، اور قرآنی حکم میں نرمی کا اعلان کرنے لگے۔ اب کوئی شخص پوری امت کے متفقہ فیصلہ کو بدلنے کی درخواست کرے اس کا حکم کیا ہے؟ اس کا فیصلہ خود مسلمان کرسکتے ہیں، ہمیں کابینہ وزیر سے کوئی ذاتی پرخاش نہیں، نہ ہمارا کوئی سیاسی رابطہ بلکہ جب ہم کو تقریر سننے کو ملی تو حقیقت عوام کے سامنے رکھ دینا ضروری سمجھا۔

ہم تو یہ سب سمجھتے ہیں اور شاید تمام مسلمان بھی کہ ایسی جرأتیں خطرناک قسم کے اسلام دشمن لوگ ہی کرسکتے ہیں۔ چہ جائیکہ وہ کریں جو اپنے آپ کو اسلام اور

مسلمانوں کا مسیحا کہیں۔ چاہیے یہ تھا کہ اگر یہ غلط سوچ پیدا ہوئی تھی اور اس پر قاضی شہر حضرت مولانا مفتی سید شاہد علی صاحب رضوی ناظم اعلیٰ و شیخ الحدیث مرکزی درس گاہ اہل سنت الجامعۃ الاسلامیہ گنج قدیم رامپور نے تنبیہ کی تھی اور اس پر تنبیہ کرنے والے عالم دین کا باقاعدہ شکریہ ادا کیا جاتا، مگر افسوس کہ اس تنبیہ کرنے والے کو طرح طرح کے الزامات دینے شروع کر دیئے۔ اور اپنی سیاسی طاقت و موجودہ حکومت اتر پردیش (ایس پی) میں اپنی بالا دستی خوب ناجائز استعمال کرتے ہوئے علمائے اہل سنت کو دھمکیاں دی جانے لگیں۔ مگر علمائے اہلسنت نے حق گوئی و بے باکی اور جواں مردی کا ثبوت دیتے ہوئے ''توبہ تحریک'' کو ختم کرنے کے بجائے اور تیز کر دیا ہے۔

اس طرح کی جرأتوں کا اگر دروازہ کھول دیا گیا تو چرب زبان لوگ اسلام کے تمام احکام پر یوں ہی چوٹ کسیں گے۔ اسلامیان ہند کے غیور فرزندان توحید کبھی اس طرح کی جرأتوں کو برداشت نہیں کر سکتے۔ وہ اپنے دین کی خاطر ہر طرح کی قربانی دینے کو تیار رہتے ہیں، اور وقت بتا دے گا کہ غیور مسلمان کیا فیصلہ کرتے ہیں، سب حقیقت عوام کے سامنے آ گئی ہے۔

لہٰذا الزام تراشی کا یہ سلسلہ بند ہونا چاہیے۔ اور اپنی غلطی کے عوض تمام مسلمانوں کی رسوائی رک جانی چاہیے، اور وزیر موصوف کو مسلمانوں اور اسلام کی عزت کا پاس رکھنا چاہیے، ورنہ اگر مسلمانوں کے جذبات سے یہ کھلواڑ جاری رہا تو ہوسکتا ہے کہ یہ مخالفت عوام کی تحریک بن جائے۔ وزیر موصوف اور ان کے ہم نواؤں کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے۔ کابینہ وزیر کو چاہیے کہ جلد سے جلد علانیہ توبہ کریں اور امت مسلمہ کی دل آزاری پر معافی چاہیں۔

اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں ارشاد فرماتا ہے:

"یا ایھا الذین اٰمنوا توبوا الی اللہ توبۃً نصوحاً، عسیٰ ربکم ان یکفر عنکم سیاٰتکم" (التحریک ۸)

''اے ایمان والو! توبہ کرو اللہ کے حضور کہ سچے دل سے امید ہے تمہارا رب دور کردے گا تم سے تمہاری برائیاں'' (کنز الایمان)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"انی لا ستغفر اللہ فی الیوم اکثر من سبعین مرۃ"

(بخاری شریف)

بے شک میں اللہ تعالیٰ سے توبہ کرتا ہوں دن میں ستر مرتبہ سے زیادہ۔

وزیر موصوف پر علمائے اہل سنت نے جو حکم شرعی نافذ کیا ہے اس پر عمل درآمد ہونا چاہیے۔ اس سے قبل جب اترانچل اور یوپی مشترکہ صوبہ تھا تو وزیر موصوف وقف کے وزیر مملکت تھے۔ درگاہ حضرت صابر پاک کلیری کا دورہ کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ اگر میرا بس چلے تو میں یہاں پر بلڈوزر چلوادوں اور بیت الخلاء بنوادوں (معاذ اللہ) اس پر مسلمانوں نے زبردست احتجاج کیا تھا۔

امت مسلمہ کی حالت زار کا تجزیہ:

اسلامیانِ ہند کی اس وقت حکومتی تجزیہ کے مطابق ۱۹ رکروڑ تعداد ہے، اور میرے تجزیہ کے مطابق ۲۵ رکروڑ رتعداد ہے۔ اتنی بڑی اکثریت ہندوستان میں عرب کی سرزمین سے داخل نہیں ہوئی تھی بلکہ چند نفوس قدسیہ بغرض تجارت ہندوستانی کے ساحل سے اندرون ملک داخل ہوئے، اور اولیائے کرام بزرگان دین کی دعوت و ارشاد نے وہ رنگ کھلایا کہ آج ۲۵ رکروڑ کی تعداد میں امت مسلمہ آباد ہے۔ جہاں ایک طرف یہ بات قابل اطمینان ہے کہ ہماری تاریخ وتہذیب، عمل وکردار نے ایک جہان کو متاثر کیا ہے، وہیں دوسری طرف موجودہ صورت حال پر شرمندگی کا بھی احساس ستاتا ہے۔ حجۃ الاسلام مولانا حامد رضا خاں بریلوی نے ۱۹۲۵ء میں ایک عظیم الشان کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ''اگرچہ اسلام کی نشو ونما ہی

مخالفتوں میں ہوئی، اور ہر زمانہ میں مخالفین کی زبردست طاقتیں اس کے درپہ پیکار رہیں۔ لیکن عہد حاضر کے مصائب اور دور موجودہ کے فتنے بہت زیادہ مہیب اور بھیانک نظر آرہے ہیں۔ ایک طرف تو مختلف قسم کے دشمنوں کا اسلام اور مسلمانوں کو مٹانے کے لیے ٹوٹ پڑنا، اور اس خیال میں مجنونانہ کوششیں کرنا، اور شب و روز مصروف ایذا و آزار رہنا، اور مسلمانوں کی تباہی و بربادی کو اپنی زندگی کا بہترین مقصد قرار دینا، دوسری طرف مسلمانوں کی ہر طرح کی کمزوری اپنے مال سے غفلت اپنی حفاظت سے بے پرواہی، مذہب سے ناواقفیت، باہمی مناقشات، تھوڑی سے طمع پر دشمنان اسلام کی تائید اور غداری پر آمادہ ہوجانا، اپنے اوپر اعتماد نہ کرنا، دشمنوں کو دوست سمجھنا، اپنے آپ کو ان کے ہاتھوں میں دے دینا، دوست نما دشمن اور مسلم نما بدخواہوں کو نہ پہچاننا، امراء کا غرباء سے نفرت کرنا، اپنے اسلامی بھائیوں کو ان کی غریبی یا ناداری کی وجہ سے بنظر حقارت دیکھنا، پیہم پیش کرنے والے حوادث سے عبرت پذیر نہ ہونا، بار بار اہل غرض کے فریب میں آجانا، اور کمال بدعقلی سے پھر بھی ہوشیار نہ ہونا، اور ان کے دام تزویر کا شکار ہوتے رہنا، یہ وہ حالات ہیں جن پر نظر کر کے کہا جاسکتا ہے کہ پچھلے ادوار میں جن مسلمانوں کو جن مصائب کا سامنا پڑتا رہا ہے، وہ ان عبرت انگیز حالات کے مقابل ہیچ ہیں۔ بہت سے ملت فروش مسلمانوں کی نمائشی ہمدردبن کر ان کے رہنمائی کے لیے دعا دی کہ ساتھ دشمنانِ اسلام سے دولت حاصل کرنے کے لالچ میں مسلمانوں کی بدخواہی اور اغیار کی خدمت گزاری کر رہے ہیں۔ مسلمان ان کے اسلامی نام اور دعوی اسلام کے دھوکے کھاتے اور غلطی کا شکار ہوجاتے ہیں''۔ یہ الفاظ جماعت اہل سنت کے ایک دردمند مفکر کے ہیں۔ جنہوں نے اسلامی معاشرہ کی حالت زار کا اپنے الفاظ میں نقشہ کھینچا ہے۔ اب اس پر مزید لکھنے اور تبصرہ کرنے کی نہ ضرورت ہے اور نہ ہی حاجت باقی رہ جاتی ہے۔

جماعت اہل سنت کے دوسرے مفکر برہان ملت مولانا مفتی برہان الحق

رضوی جبل پوری نے ۱۰/۱۱/۱۲ مئی ۱۹۹۸ء کو بہار صوبائی کانفرنس سیوان میں صدارتی خطبہ میں کچھ اس طرح ملت اسلامیہ کا جائزہ لیا ہے''۔ اکابر ملت واخوان ملت دنیا کی وہی قومیں زندہ ہیں جن کی روایات زندہ ہیں، جنکا ضابطۂ حیات زندہ ہے، جن کا دستور العمل زندہ ہے، جن کے اسلاف کے حالات وواقعات زندہ ہیں۔ روایات کی زندگی کا دارومدار اسلاف کرام کی زندہ جاوید حیات، ان کے ہدایات وخیالات، ان کے حالات و واقعات، ان کے اقوال و ارشادات کی زندگی پر ہے، جو آنے والی نسلوں کے لیے اصول وضوابط، اعمال وافعال کے لیے درس اور شاہراہ ہدایت کے لئے سراج منیر کا کام دیں، یہ اسی وقت ممکن ہے جب دونوں ہفتوں، مہینوں، سالوں کے دور وتسلسل اور تداول لیل ونہار کے درمیان، محدثات، جدید خیالات، اور بدلتے ہوئے طرز حیات کو اپنے ان اسلاف کرام وہادیان عظام، ورہبران ذوی الاحترام کے محفوظ ومنضبط ارشادات واصول وہدایات کے ساتھ موازنہ کریں۔ ان کے اقوال وافعال کو، اطوار وعادات کو اور ان کے مواعظ ونصائح کو اس موازنہ کے لیے شمع ہدایت بنائیں۔ آج کا انقلابی دور بڑا آزمائشی اور منزلۃ الاقدام دور ہے۔ انسان آزاد، خیالات آزاد، اخلاق آزاد، عقائد آزاد، مذہب آزاد، اس ناپاک آزادی کے دور نے ان گستاخ اور بے باک باغیوں کو خوب ہوا دے رکھی ہے''۔

ان حالات کے پیش نظر اسلامیان ہند کو اپنے قول وفعل، کردار وعمل میں تبدیلی لانا از حد ضروری ہے تاکہ داعیانہ طریقہ، تبلیغ موثر ثابت ہو سکے اور اغیار پر اسلام ومسلمین کی دھندلی تصویر صاف وشفاف آئینہ کی طرح ہو جائے۔

تنظیم اہل سنت کی تشکیل کا منصوبہ:

برصغیر میں بالخصوص ہندستان، پاکستان، بنگلہ دیش، سری لنکا اور نیپال میں اہل سنت وجماعت کی آبادی اکثریت میں ہے۔ اور یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ جس ملک کی آبادی میں اکثریتی طبقہ ہوتا ہے اس کی عنان قیادت اس اکثریتی طبقہ کو حاصل

ہوتی ہے، مگر یہاں معاملہ اس سے مختلف نظر آتا ہے۔ مذکورہ تمام ممالک میں عنان قیادت دوسروں کے ہاتھوں میں ہے، اور اہل سنت و جماعت دوسرے درجہ میں تو دور کہیں تیسرے اور چوتھے میں شمار کئے جاتے ہیں، آخر ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ ناکام جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ہو یا تقسیم ملک ۱۹۴۷ء، یا موجودہ وقت کے حالات وواقعات ہوں۔ علماء کرام وقائدین ملت نے تنظیم اہل سنت کے لیے جدوجہد کیں، حالات کو سازگار بنایا گیا، ۱۹۲۳ء سے لے کر ۱۹۳۰ء تک کے زمانۂ ارتداد میں متحدہ جدوجہد ہوئی، جس کے نتیجہ میں پانچ لاکھ فرزندگان توحید ورسالت نے اپنے ایمان کا تحفظ برقرار رکھا۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں فاضل بریلوی قدس سرہٗ کے عرس مقدس ۱۳۵۸ھ میں حجۃ الاسلام مولانا حامد رضا خاں بریلوی نے تنظیم اہل سنت کی تشکیل کا منصوبہ بنایا تھا، اپنے مرید خاص کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''عزیزم! میں نے اس بلائے عظیم کو دیکھتے ہوئے چاہا تھا کہ اہل سنت کی تشکیل ہو جائے اور علماء کرام ایک تنظیم کے تحت اپنی وہ آواز حق بلند کریں جو حضور پرنور اعلیٰ حضرت رضی اللہ عنہ کی آواز تھی، یعنی کفار ومشرکین سے موالات حرام ہونا، اور یہ آواز حضور پرنور ہی کی آواز نہیں اللہ ورسول (جل جلالہ وصلی المولیٰ تعالیٰ علیہ وسلم) کی صدائے برحق ہے۔ ہماری آواز پر اہل سنت لبیک کہیں گے اور ہماری منظم جماعت کی آواز ملک وقوم میں اپنے سر کے کانوں ہی تک نہیں، دلوں کی گہرائیوں میں اثر کرے گی۔ عرس سراپا قدس امام اہل سنت رضی اللہ عنہ میں جو اکابر علماء اہل سنت تشریف لائے تھے، میں نے ان سب کو جمع کر کے اس تنظیم کی تحریک کی تھی، مگر شومئی قسمت کہ بعض حضرات کو ایک آنکھ نہ بھائی۔ مجلس مشاورت سے انہوں نے اس تفریق کو نظر استحسان سے دیکھا۔ پیارے عثمان! کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ میں نے جو راہ عمل نکالی تھی اس میں کوئی شرعی نقص تھا؟ یا کوئی کفر گمراہی کا راستہ تھا، جس کی یوں تخریب روا رکھی گئی؟ مجھے اس کی ان صاحبوں سے ضرور

شکایت ہوئی اور ہے۔ جب یہ سب بنایا کھیل بگاڑ دیا تو مجبوراً میں اور دوسرے صاحبان بھی اٹھ کر چلے آئے''۔

جماعت اہل سنت کی تشکیل کے لیے ۱۹۶۱ء میں سنی اوقاف کانفرنس دہلی کے نام سے بھی کوششیں ہوئی ہیں۔ ۱۹۹۰ء میں اجتماع ہوا پھر ۱۹۹۵ء میں راقم السطور نے بریلی میں ایک اور کوشش کی بالآخر آج تک ملکی سطح پر کوئی بھی تنظیم و جماعت قائم نہیں ہوسکی، یہی وجہ ہے، کہ ہماری آواز بے وزن ہوکر رہ جاتی ہے۔ مرکزی حکومت ہو یا ریاستی حکومتیں ہر جگہ غیروں سے ہی قومی وملی مسائل میں صلاح ومشورہ اور تبادلۂ خیال کیا جاتا ہے۔ یہ ایک پوری جماعت اہل سنت کے لیے لمحۂ فکریہ اور المیہ ہے۔

ملکی سطح کی تنظیم کا خاکہ اس طرح بنائیں:

مسلمانوں کے قومی وملی مسائل اور ان کے حل کے لیے یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ ہندوستان کی تقریباً ۷۰ فیصد آبادی گاؤں دیہات میں رہتی ہے، مگر جتنی بھی اسکیمیں پلان ہوتا ہے، ان کا محور ومرکز شہری علاقے ہوتے ہیں جبکہ صرف ۳۰ فیصد آبادی شہروں میں رہتی ہے۔

ایک ایسی تحریک وتنظیم کی اشد ضرورت ہے جو اسلامیانِ ہند کی قومی وملی مسائل کے لیے جدوجہد کرے، راقم السطور کے ذہن کے مطابق اس کا ڈھانچہ پہلے ملکی سطح پر ہو، جو نیشنل باڈی کہلائے، جس میں ہر صوبہ سے کم از کم پانچ پانچ متحرک فعال شخصیات کو لیا جائے، پھر صوبائی کمیٹی کی تشکیل عمل میں لائی جائے جس میں صدر ریاستی مرکز سے تعلق رکھتا ہو، باقی ہر ضلع سے ایک عالم یا مفتی اور دو یا تین متحرک و فعال شخصیت کو شامل کیا جائے۔ پھر ضلعی سطح پر کمیٹی بنائی جائے جس میں ضلع ہیڈ کوارٹر کا صدر منتخب کیا جائے اور ہر تحصیل و بلاک اور قابل ذکر گاؤں سے ایک ایک فرد کو ضلع کمیٹی میں شامل کیا جائے۔ بعدہٗ آخری مرحلہ میں تحصیل کمیٹی کی تشکیل ہو جس میں

متعلقہ تحصیل دار ملحقہ گاؤں سے ایک ایک فرد کو کمیٹی کے لیے انتخاب کیا جائے، پھر انشاء اللہ تعالیٰ تحصیل سے لے کر ملکی سطح پر باضابطہ طور پر تنظیمی و جماعتی ڈھانچہ تیار ہو جائے گا۔ اور بروقت اس کا استعمال بھی کیا جا سکتا ہے۔ مرکزی راجدھانی سے لے کر ضلعی ہیڈ کوارٹر تک آپس میں ایک دوسرے کا رابطہ و تعلق اور ساتھ ہی ساتھ وقوع پذیر حالات پر تبادلہ خیال پھر اس پر تنظیم و تحریک کا عندیہ منظر عام پر آنا ضروری ہے۔

اسلامیانِ ہند کی فلاح و بہبود کے لئے گاؤں دیہات میں اسکول، کالج اور مدارس و مکاتب قائم کئے جائیں۔ تعلیم یافتہ بے روزگاروں کی روزگاری کے میدان میں رہنمائی کی جائے، حکومتی دفاتر میں نکلنے والی جگہوں میں نشاندہی کر کے فارم بھروائے جائیں اور اہل اثر لوگوں سے سفارش کروانے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ مسلمان اپنا انجینئرنگ کالج، میڈیکل کالج، گرلس و بوائز ڈگری کالج، انٹر کالج، پرائمری اسکول وغیرہ قائم کریں۔ عربی اور انگریزی زبان کے لکھنے و بولنے پر زور دیں تاکہ ان بین الاقوامی زبانوں کے ذریعہ روزگار کے مواقع فراہم ہو سکیں۔ مسلمان اپنے بینک، کمپنی اور تجارتی ادارے قائم کریں اور ان میں بالخصوص مسلم نوجوانوں کو ملازمت دیں۔ اس سے پورے خاندان کی معاشی حالت بہتر ہوگی۔ غریب و نادار اور مفلوک الحال کے لئے زکوٰۃ، صدقات و خیرات اور اوقاف کی آمدنی کو اجتماعی شکل دے کر امداد کے لیے بیت المال قائم کریں۔ ایسے خاندان کے بچوں کو بلا فیس تعلیم یافتہ بنا کر روزگار سے لگوائیں، تاکہ یہ خود کفیل ہو سکیں اور جگہ جگہ کاسۂ گدائی سے بچ سکیں۔ زکوٰۃ کا اجتماعی نظام قائم کیا جائے۔ عشر و فطرہ اور چرم قربانی کا بھی اجتماعی نظام ہو تاکہ اس سے امت مسلمہ کی فلاح و بہبود کے لئے بہت بڑے کام کر سکتے ہیں۔

●●●

Chairman
National Commission for Minorities,
Government of India
Lok Nayak Bhawan 5th Floor, Khari Market, New Delhi- 110003
Tel No. (O) 011-24690809, Fax No. 011- 246426645

Chairman
Maulana Azad Education Foundation
(Ministry of Social Justice & Empowerment, Govt. of India)
Chemsford Road, New Delhi, 110055
Tel No. (O) 011-23583788,23583789 Fax No. 011- 23561945
Website: www.maef.nic.in

Chairman
State Minorities Commission , U.P.
633, Indira Bhawan, Lucknow
Tel No. 91-522-2287097, 2286346

Chairman
National Minorities Development & Finance Corporation,
(Ministry of Minorities Affairs Govt. of India)
Scope Minor, Laxmi Nagar,
New Delhi, 110092
Tel 91-011-22441442, 22441443, 44, 45, Fax.011-23561945
Website: www.mmdfc.org

Government of India
Ministry of MinoritiesAffairs
11th Floor, Paryavaran Bhawan
CGO Complex, Lodi Road, New Delhi- 110003

Prime Minister's
New 15 Point Program for Welfare of Minorities
Ministry of Minorities Affairs (Govt. of India)
11th Floor, Paryavaran Bhawan
CGO Complex, Lodi Road,
New Delhi- 110003

Andhra Pradesh State
Minorities Financial Corporation
5th Floor Haj House, Nam Pally HYDERABAD 500001 (A.P.)
Tel No. 91-0361-2595480

Bihar State
Minorities Financial Corporation
34th Ali Imam Path, Harding Road , PATNA (BIHAR)

WEBSITES:

Ministry of Minority Affairs
Website: www.minorityaffairs.gov.in

Maulana Azad Education Foundation
Website: www.maef.nic.in

National Minorities Development & Finance Corporation,
Website: www.mmdfc.org.

Central Wakf Council
Website: www.centrawakfcouncil.org.

National Council for Promotion of Urdu Language
Website: www.urducouncil.nic.in

Ministry of Women and Child Development
Website: www.wed.nic.in

Ministry of Human Resources Development
Website:www. education.nic.in

Ministry of Social Justice & Empowerment
Website.www. socialjustice.nic.in/sed/welcome.htm

National AIDS Control Association
Website:www.nacoonlinc.org.

NAZIM BEG
Secretary
All India Jamat Raza-e- Mustafa
BAREILLY- Tel. No. 9412289134